www.shibliinternational.com

اگست 2018

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

-/15 روپے

New Niloufer Cafe & Restaurant

نیو نیلوفر کیفے اینڈ ریسٹورنٹ

A Multi Cuisine A/c Restaurant

We undertake catering & party orders

The Best MULTICUISINE RESTAURANT in Hyderabad.

Opp. Niloufer Hospital, Red Hills,
Lakdi ka Pul, Hyderabad.

Cell: 8790439143, 9848036940, 9704150262 Email: nncr786@gmail.com

New غزالہ ساریز Gazala Sarees

All kinds of Wedding Sarees, Suits & Sharara

+91 9848668219, 8686978846

#23-2-241 Volta Hotel Lane New Moghalpura Hyderabad T S

اگست ۲۰۱۸ء

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد:۱۔شمارہ:۷

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامؔی

پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی

پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹؔ

محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان

ابوہریرہ (اینکر: نیوز 18) محسن خان

قیمت فی شمارہ: 15

سالانہ: 150 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL

A/c: 52023475202

Ifsc: SBIN0020413

Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,

Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	5
۲	مناجات/نعت شریف	حضرت رحمٰن جامؔی	6
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	7
۴	عبدالغفور نساخ: حیات اور کارنامے	پروفیسر مظفر علی شہ میری	11
۵	اور ہندستان آزاد ہو گیا	محمد انور داؤدی	17
۶	عیدالاضحیٰ ایک عظیم یادگار	عبدالوحید ندوی	25
۷	جنگ آزادی کا مجاہد	ڈاکٹر ضیاء احمد	27
۸	غزل	ڈاکٹر سراج احمد انصاری	30
۹	یوم آزادی (نظم)	اقبال سہیل	31
۱۰	اردو اور قمر رئیس	ڈاکٹر جمیلہ بی بی	32
۱۱	اقبال فہمی	احمد نور عینی	36
۱۲	مسجد نبوی کے توسیع اور مختلف ادوار میں اس کی تاریخ	رفیعہ تبسم	37
۱۳	حضرت محمد رفیع الدین قندھاریؒ	حکیم سید شاہ خیر الدین قادری صوفی	39
۱۴	پاکستان کو ملا نیا کپتان (کھیل)	ابو ہریرہ ایوبی	40
۱۵	احکام فطرت کی شرعی و سائنسی حیثیت (تبصرہ)	مولانا سید ومیض ندوی	41

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

الحاج نواب **حیدر علی**، کنگ کوٹھی حیدرآباد.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد..... **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی۔

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ جناب **محمد ابوطاہر** انجینئر، ٹولی چوکی حیدرآباد

اداریہ

اگست کا مہینہ جیسے ہی آتا ہے ذہن ودماغ میں یوم آزادی کا منظر گردش کرنے لگتا ہے اور سوال قائم ہوتا ہے کہ آزادی کی لڑائی انگریزوں سے کیوں لڑی گئی؟ اس کے لیے ہندستانیوں کو کتنی قربانیاں دینی پڑیں؟ اور انگریزوں نے اپنے جانے کے بعد ہندستان میں کیا چھوڑا؟

ہمارا پیارا ملک اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر طرح سے انگریز کا غلام ہو گیا تھا۔ اس غلامی کے طوق سے نکلنے کے لیے آزادی کی لڑائی لڑی گئی۔ اس کے لیے لاکھوں ہندستانیوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ملازمت، تجارت، جائیداد اور جاگیروں کو داؤ پر لگا دیا، قید وبند کی صعوبتوں کو آزادی کے لیے خوشی سے قبول کیا۔ تختہ دار پر ملک کے لیے مسکراتے ہوئے جھول گئے اور یہ کہنا پڑا ؎

اے میرے وطن کے لوگو ذرا آنکھ میں بھرلو پانی
جو شہید ہوئے ہیں ان کی ذرا یاد کرو قربانی

انگریزوں نے اپنے اقتدار کی بقا کے لیے گنگا جمنی تہذیب کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔ ہندو مسلمانوں میں گائے، خنزیر، مسجد اور مندر کے جھگڑے کو رکھ دیا اور اس ملک کو کمزور کرنے کے لیے نہ صرف ملک کو تقسیم کیا بلکہ دلوں میں گہرا شگاف کر دیا جو آج بہتّر سال ہونے کے بعد بھی بھر نہیں رہا ہے۔ اے میرے وطن کے لوگو! کاش کہ آج بھی انگریزوں کی مکاری کو سمجھتے تو ایسی نفرتوں کی دیوار حائل نہیں ہوتی، اپنے اقتدار کے لیے اس کارڈ کو انگریز نے کھیلا تھا لیکن اسے منھ کی کھانی پڑی اور حق کا بول بالا ہوا اور ملک آزادی کے جشن میں ڈوب گیا اور آج بھی یہی کارڈ کم وبیش سیاسی پارٹیاں کھیل رہی ہیں، پھوٹ اور نفرت پھیلا کر ووٹ حاصل کر کے اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو جائیں۔ انہیں ملک کی بے روزگاری، مہنگائی، کرپشن، کمیشن، کسان، بیماری، صنعت وحرفت اور تعلیم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں ہے، بلکہ مذہب اور آستھا کا نام لے کر بھولے بھالے لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اہل علم ودانش سیاست اور اقتدار کے گلیاروں میں آئیں کیونکہ ملک کو آزادی کے بعد ایک اور آزادی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

آزادی کے لیے جس زبان وادب نے اہم کردار ادا کیا ہے وہ ہے اردو جو محبت اور اعلیٰ اقدار کی نشانی ہے، جو دلوں کو جوڑنے کا اور حق کے لیے پُر جوش آواز بلند کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے، سوتوں کو جگاتی اور ظالموں سے پنجہ آزمائی کرتی ہے۔ چنانچہ اردو نظم ونثر کے ذخیرے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان وادب نے اس ملک سے انگریزوں کو دربدر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور مجاہدین آزادی کے دلوں میں جوش وولولہ کی روح پھونک دی، ''انقلاب زندہ باد'' کی صدائیں پورے ملک میں بلند ہونے لگیں۔ اردو آزادی کی زبان ہے، جس کی وجہ سے ملک آزاد ہو گیا مگر آزادی کے بعد سات دہائی گزرنے کے بعد بھی آج اردو تعصب کا شکار ہے۔ حالانکہ اس کے اشعار کی گونج لوک سبھا، راجیہ سبھا اور ودھان سبھا کے ایوانوں میں سنائی دیتی ہے۔

عربی کا مشہور جملہ ہے ''الجنس یمیل الی الجنس''، جنس، جنس کی طرف مائل ہوتی۔ پورے دنیا کے انسانوں کی جنس جن کی ایک ہی ہے، موجودہ تعداد سات ارب دو کروڑ ہے۔ تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ انسانوں کو زبان، ملک اور علاقے کے حساب سے دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ دنیا کے سبھی مذاہب انسانوں کی قدر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ آج جو آسام کی صورتِ حال ہے، وہ کافی تشویش ناک ہے۔ چالیس لاکھ کے قریب لوگوں کو بے وطن ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ ملک اور انسانیت کی بے عزتی ہے۔

معزز قارئین ادارہ صمیم قلب سے آپ کی خدمت میں عیدالاضحیٰ اور یوم آزادی کی مبارکبادی پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

حضرت **رحمٰن جامی**، حیدرآباد

مناجات

تو اپنے مہروکرم سے مجھے نکال نہ دے
مرے خدا مجھے رحمت سے اپنی ٹال نہ دے

گنہگار ہوں دوزخ میں مجھ کو ڈال نہ دے
مرے کریم سزا میرے حسبِ حال نہ دے

جہاں کے آگے نہ کر مجھ کو اور شرمندہ
برا ہوں میں تو بہت تو مری مثال نہ دے

عروج دے مگر اس بات کو بھی رکھ ملحوظ
کہ زندگی میں کبھی پھر مجھے زوال نہ دے

کمالِ فن سے مرے سب کو فائدہ پہنچے
بھلا نہ ہو جو کسی کا تو پھر کمال نہ دے

مرے وجود سے لے کام حُسن کاری کا
ضرور کسی کو بھی پہنچانے کا خیال نہ دے

یہ ماہ وسال تو گزرے صدی صدی کرکے
اب انتظار میں صدیاں دے ماہ وسال نہ دے

کھڑا ہے تیرے کرم کی اُمید میں جامؔی!
ترے کرم کی قسم اب تو اس کو ٹال نہ دے

نعت شریف

میں خود کو بھول جاتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے
مقدر کو جگاتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے

میں جب بھی دیکھتا ہوں آئینہ بس مسکراتا ہوں
میں جب بھی مسکراتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے

مدینہ یاد آتا ہے تو دل لگتا ہے یادوں میں
خدا سے دل لگاتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے

میں شاعر ہوں تو کھو جاتا ہوں خوابوں میں خیالوں میں
پھر اک دم جاگ جاتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے

یہی پھر سے تمنا ہے کہ دیکھوں گنبدِ خضریٰ
دعاء کو ہاتھ اٹھاتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے

قلم چلتا ہے نعتیں ہوتی جاتی ہیں بلا کھٹکے
قلم اپنا چلاتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے

سفارش کو خدا کے پاس جامؔی اپنے آقاؐ کو
مِرا دُکھڑا سناتا ہوں مدینہ یاد آتا ہے

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

محمد امین زبیری

منشی محمد امین زبیری (۱۸۶۴۔۱۹۵۴ء) صیغہ تاریخ ریاست بھوپال کے ایک عرصے تک مہتمم رہے، علامہ شبلی کے ملنے والوں میں تھے۔ ۱۹۰۷ء میں علامہ شبلی سے ان کا ربط و تعلق قائم ہوا، چونکہ اس زمانے میں بیگم سلطان جہاں کے قریبی لوگوں میں تھے، چنانچہ انہوں نے سیرت کے سرمایہ کی فراہمی کے لیے بیگم کو متوجہ کیا اور بیگم نے سیرت کا سارا ذمہ ہی لے لیا، ان کی اس کوشش کی وجہ سے علامہ سے ان کے روابط گہرے ہو گئے، خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا اور علامہ نے ان کے نام شکر گزاری کے خطوط لکھے۔ یہ تعلق علامہ شبلی کے دم پسیں تک قائم رہا، اسی تعلق کی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں دارالمصنفین کا رکن نامزد کیا اور ان سے دارالمصنفین کے قیام کے سلسلے میں مشورے کیے۔

یہ بھوپال سے خواتین کے لیے ایک رسالہ ظل السلطان نکالتے تھے، علامہ شبلی نے اس کی تعریف کی ہے اور بعض اہل قلم کو اس میں مضامین لکھنے کا مشورہ دیا، اسی رسالے سے زبیری صاحب کی رسائی بیگمات فیضی تک ہوئی، بگماں انہیں معلوم ہوا کہ عطیہ کے نام شبلی کے متعدد خطوط محفوظ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حاصل کیا اور ان کی نقل تیار کی ان کی خواہش تھی کہ انہیں مکاتیب شبلی کے دوسرے ایڈیشن میں بقول ان کے شامل کر دیا جائے مگر سید صاحب راضی نہ ہوئے چنانچہ انہوں نے بابائے اردو کے مجبور کرنے پر انہیں کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں بھوپال سے شائع کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا۔ ان دونوں اشاعتوں پر دیباچے لکھے، پہلی اشاعت میں مختصر مگر دوسری اشاعت میں قدرے تفصیل سے اور انہی دونوں دیباچوں کا مطالعہ پیش نظر ہے، انہوں نے علامہ شبلی پر دو اور کتابیں بھی لکھی ہیں ایک ''ذکر شبلی'' اور دوسری ''شبلی کی رنگین زندگی''۔ ان دونوں کتابوں کے دو ایڈیشن دو مختلف ناموں سے مگر اضافہ کے ساتھ شائع ہوا گو وہ انہیں خوب سے خوب تر بناتے رہے۔

خطوط شبلی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا اس کے سبب اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس وقت نادر مجموعہ جناب زہرا بیگم صاحبہ اور جناب عطیہ بیگم صاحبہ کی عنایت سے میرے ہاتھوں تک پہنچا اسی وقت میں نے مکاتیب شبلی میں اس کمی کو محسوس کیا اور خیال کیا کہ اس کو شائع کر دیا جائے، لیکن چونکہ میں محض مالی دقت کے لحاظ سے شائع نہیں کر سکتا تھا، اس لیے میں نے مولانا شبلی مرحوم کے ایک نہایت ارادت مند فاضل دوست کو جن کی ذرا سی توجہ سے اس کی اشاعت کی کفیل ہو سکتی تھی، لکھا لیکن جناب موصوف نے بعض وجوہ سے ان خطوط کی اشاعت ہی مناسب تصور نہ فرمائی اس لیے میں بھی کسی قدر بصد ہو گیا اور دیگر دوستوں اور بزرگوں سے مشورہ لیا ان میں بعض نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اور بعض نے علی حالہ شائع کرنے کی رائے دی اور خصوصاً مولوی عبدالحق صاحب نے تو اشاعت پر مجبور ہی کر دیا اس لیے یہ مجموعہ شائع کیا جاتا ہے''۔ (خطوط شبلی طبع اول، ص:۳)

اس کی اہمیت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''غالباً اردو فارسی زبان میں ایسے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ ہوگا کہ ایک علامہ دوراں نے خواتین کے نام لکھے ہوں

اور اس میں عورتوں کی مختلف خصوصیات کے متعلق ایسے گراں مایہ خیالات ہوں''۔(ایضاً)

زہرا بیگم اور عطیہ فیضی کے دل میں شبلی کے احترام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' مجھے یہ بھی کہنا ضرور ہے کہ ان دونوں بیگمات کے دل میں مولانائے مرحوم کی خاص عظمت ومحبت ہے۔ یہ خطوط ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں اور میں نے دیکھا کہ نہایت حفاظت کے ساتھ ان کی آہنی الماری میں رکھے ہوئے تھے اور ہزاروں اطمینان دلانے کے بعد مجھے اجازت دی گئی کہ میں ممبئی میں اپنے قیام گاہ پر ان کی نقل کردوں''۔

نقل کرتے وقت چند خطوط پر پنسل سے ایک نشان دیا گیا تھا اس پر عطیہ صاحبہ کو بہت افسوس تھا اور انہوں نے ایک خط میں بھی اس افسوس کو ذرا تند الفاظ میں ظاہر کیا''۔(ایضاً،ص:۳،۴)

عطیہ فیضی کے شوہر مسٹر رحمین ایک بڑے مصور تھے ،انہوں نے علامہ شبلی کی ایک تصویر بنائی تھی۔ اس کے بارے میں زبیری صاحب لکھتے ہیں:

''ان کے شوہر مسٹر رحمین فیضی نے مولانا کی ایک تصویر بنائی تھی مسٹر رحمین ایک مشہور آرٹسٹ ہیں اور اس تصویر میں انہوں نے فن مصوری کا کمال دکھایا ہے،فرانس کی نمائش ۱۹۱۳ء کی آرٹ گیلری میں اس کی بے انتہا قدر کی گئی اور نہایت معقول قیمت لگی،لیکن عطیہ بیگم صاحبہ نے اس کو جدا کرنا گوارا نہ کیا''۔(ایضاً،ص:۴)

خطوط شبلی کا انتساب بھی زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کے نام سے ہے،اس کی وجہ زبیری صاحب نے یہ لکھی ہے کہ

''یہ دونوں بہنیں جس وقت مولانا کا تذکرہ کرتی ہیں اور ان کے واقعات سناتی ہیں تو ان کے لب ولہجہ اور الفاظ سے وہ احترام اور عظمت اور وہ محبت نمایاں ہوتی ہے جس کا تعلق سننے اور دیکھنے سے ہے''۔ایضاً)

اس دیباچے میں سبب اشاعت خطوط کی انفرادیت فیضی بیگمات کی شبلی سے والہانہ عقیدت کے سوا کچھ نہیں ہے، نہ علامہ شبلی کے علم وفضل کا ذکر ہے نہ ان کے خطوط نگاری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور نہ ان کے خطوط کی اہمیت وافادیت کا ذکر ہے۔

۹/سال بعد ۱۹۳۵ء میں انہوں نے تاج کمپنی لاہور سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا اور پہلے ایڈیشن میں جو کمیاں رہ گئی تھیں دور کیا، اس کی نشاندہی تو انہوں نے نہیں کی ہے کہ پہلے ایڈیشن میں کیا کمی رہ گئی اور کیسے دور کی گئی، البتہ جو چیز سامنے ہے وہ یہ کہ اس میں انہوں نے مفصل دیباچہ لکھا ہے۔اس میں علامہ شبلی کے حالات پر ایک نظر ڈالی ہے، اپنے لحاظ سے انہوں نے ان کی عظمت اور خصوصیات بیان کی ہیں، ان کی جذباتی فطرت کا ذکر کیا ہے اور اس فطرت کو انہوں نے علامہ کے تمام علمی، ادبی اور شعری کارناموں پر حاوی ثابت کیا ہے۔خاص طور پر بیگم سلطان جہاں کی سواری اور سلطان عبدالحمید کی رسم سلاملق میں شرکت اور ان مواقع پر ان کی جذباتی کیفیت وغیرہ کو قلم بند کیا ہے،اس سے متعلق اور بہت سی مثالیں دی ہیں اور جذباتی ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''اس قسم کے بکثرت واقعات ہیں اور ان کی یہ حالت ان کی نظموں،، خطوں، مضامین حتی کہ بعض تصنیفات میں بھی نمایاں ہے۔ان کے اکثر عظیم الشان کارناموں کا محرک ہیں ، یہی جذبہ ہے، سیاسیات ملکی، وقف علی الاولاد کو قانونی حیثیت میں لانے کی سعی مشکور۔دارالمصنفین کا قیام سب ایسے ہی جذبات کا نتیجہ ہیں''۔(خطوط شبلی،ص۶)

اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور علامہ شبلی کے خواتین کے بارے میں جو خیالات تھے ان کا ذکر کرتے ہیں اور امرت سر اور دہلی کی ان کانفرنسوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں علامہ نے خواتین کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے گفتگو کی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے ایک خط کا جو انہوں نے مولانا ظفر علی خان کو لکھا تھا کا اقتباس نقل کیا

ہے(ص:۷) پھر ذاتی طور پر ان سے خواتین کے سلسلے میں جو گفتگو رہی ان کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ علامہ شبلی نے ان سے کہا کہ ''کاش کوئی لڑکی پانچ چھ برس کی عمر سے میرے ساتھ حضر میں رہتی میں خود تعلیم وتربیت کرتا اور دکھاتا کہ مسلمان خاتون کیا کچھ کرسکتی ہے''۔(ص:۸)

پہلے جذباتیت اور پھر جذباتیت کے عناصر خطوط میں، پھر خواتین کے بارے میں ان کے جذبات اور آخر میں لڑکی کی تربیت کا قصہ۔ یہ سب دراصل تسلسل کے ساتھ اس لیے ذکر کیے جارہے ہیں کہ خطوط شبلی کے ذکر میں اور آئندہ فسانہ بنانے میں نقش کا کام کریں۔

اس کے بعد وہ علامہ شبلی کے وطن، وہاں کے خواتین جہالت اور رسم وروایات میں ان کے جکڑے رہنے وغیرہ کا ذکر کے، تجرد کی زندگی اور عقد ثانی کی خواہش وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں اور اب محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں علامہ شبلی کے سر میں صرف یہی سودا سمایا ہوا تھا حالانکہ یہی وہ دور ہے جس میں وہ ندوہ کے لیے اپنی جان قربان کررہے تھے۔ الانتقاد لکھ رہے تھے، آنکھوں میں پانی آگیا، شعر العجم زیر تصنیف تھی، سیرۃ النبیؐ کا خاکہ بن رہا تھا ان کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے، اس کے بعد علامہ شبلی کی نفاست ہر چیز میں نفاست بھرا مذاق، شوخی اور غزلوں کا ذکر کرتے ہیں اور بڑی خوبصورتی سے حالی کا وہ قول جو انہوں نے دستہ گل پر لکھا تھا نقل کردیا ہے۔(ص:۹) پھر موسیقی سے مناسبت اور اس سلسلے میں ان کے مطالعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں ان کے استغنا کا بھی ذکر ہے لکھتے ہیں:

''مزاج میں استغنا اور خودداری کی صفات درجہ کمال پر تھی، انہوں نے ذاتی فائدے کے لیے کبھی تگ ودو نہیں کی اور نہ کبھی خوشامد سے ان کے لب آشنا ہوئے۔ قومی ضرورتوں کے لحاظ سے کبھی کبھی مدح سرائی ضرور کی ہے مگر بہت کم''۔

''اپنی کثیر التعداد تصانیف سے انہوں نے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا، بہت سی کتابوں کا حق تصنیف مدرسۃ العلوم، ندوۃ اور اپنے احباب کو ہبہ کردیا اور یہی نہیں بلکہ جس نے جو چاہا طبع کرالیا اور خوب نفع کمایا۔ آخر میں انہوں نے اپنا تمام علمی ذخیرہ اور نادر کتب خانہ جو تمام عمر کا سرمایہ تھا ندوہ اور دارالمصنفین کو وقف کردیا اور دارالمصنفین کے لیے ایک وسیع رقبہ کا باغ اور دو بنگلے مزید برآں تھے''۔(ص:۹۔۱۰)

پورے دیباچے میں اصل موضوع پر آنے سے پہلے انہوں نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس کو مقطع میں سخن گسترانہ بات سے تعبیر کرسکتے ہیں، پھر وہ لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا بیان سے مولانا کی طبیعت ومزاج اور خیالات کا اندازہ کرانے کے بعد اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ جس وقت ممبئی کے ممتاز خاندان فیضی سے ان کا تعارف ہوا اس وقت عطیہ بیگم اپنی تعلیم کے لحاظ سے بہت کچھ شہرت رکھتی تھیں۔ انہوں نے آزادانہ تعلیم پائی تھی اور پہلی مسلمان خاتون تھیں جو یورپ کو تعلیم کو گئی تھیں۔ ممبئی کے تعلیم یافتہ خاندانوں کی طرح آزادانہ معاشرت تھی، یہ خاندان عرصہ تک استنبول میں مقیم رہا تھا، ان کے والد تاجر تھے اور بہ سلسلہ تجارت وہاں قیام تھا۔(ص:۱۰)

اس کے بعد انہوں نے زہرہ بیگم اور نازلی رفیعہ بیگم کی قابلیت اور ذوق تصنیف وتالیف کا ذکر کیا ہے، ان کی مجالس، علماء کی قدر احترام وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور ان تینوں کے موازنہ کے بعد عطیہ بیگم کو سب سے زیادہ ذہین اور تیز لکھا ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

''مولانا نے ان میں وہ سب جوہر دیکھے جن سے ایک خاتون قابل رشک مرتبہ حاصل کرسکتی ہے۔ ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ ان جوہروں کو جلادیں اور عطیہ بیگم کو ایک نمونہ بنادیں، رفتہ رفتہ اس خاندان سے ان کے عزیزانہ تعلقات ہوگئے، پھر ندوہ کی امداد اور اتحاد خیال نے ان میں اور

مضبوطی پیدا کردی۔ راقم کو بارہا ان بیگمات سے ملنے کا موقع ملا ہے اور مولانا کی نسبت محبت واحترام کا جوش جوان میں نظر آیا وہ قریب ترین احباب اور تلامذہ میں بہت کم پایا گیا''۔(ص:۱۱)

اس کے بعد پہلے ایڈیشن کے دیباچے کو معمولی حذف واضافے کے ساتھ شامل کیا ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس میں کئی قابل ذکر باتیں ہیں۔ خاص طور پر آخری جملہ جو دراصل مولانا شروانی اور مولانا سید سلیمان ندوی پر چوٹ ہے۔ جنہوں نے خطوط شبلی کی اشاعت سے منع کر دیا تھا۔

زبیری صاحب سے شبلی کے جس زمانے میں تعلقات قائم ہوئے ان کی تمام تر توجہ سیرۃ النبیؐ کی طرف تھی، زبیری صاحب نے خطوط شبلی کے دونوں ایڈیشن کے دیباچوں میں سیرۃ النبیؐ کا نام نہیں لیا۔ نہ ان کے دوسرے مذہبی کارناموں کا ،وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس سے شبلی کی شخصیت کا جو مرقع بنتا وہ خطوط شبلی کی اشاعت کے پس منظر میں فٹ نہیں ہوتا۔ پہلے ایڈیشن کی کمی کی طرف کسی نے اشارہ بھی کیا تھا۔ خطوط شبلی کا مقدمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قلم سے ہے، جنہوں نے شبلی کی سخت اہانت کی ہے اور انہیں عاشقوں کی فہرست میں کالا کھڑا کیا ہے، مگر زبیری صاحب اس مقدمہ کے بعد بھی ان کے مداح ہیں وہ لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں نے مؤلف سیرت النبیؐ کے ساتھ ان خطوط کی نسبت کو ناپسند کیا، بعض نے ان کی اشاعت کو اس عقیدت ونیاز مندی کے خلاف جانا جو راقم کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی کے ساتھ ہے۔ بعض مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے میں متعصّبانہ جھلک دیکھی جو خود ان کے اپنے خیالات نے پیدا کردی حالانکہ مقدمہ تو ایک بہترین ادبی تبصرہ''۔(ص:۱۲)

ان تمام اعتراضات اور شکوک وشبہات کا ازالہ زبیری صاحب کے نزدیک ان خطوط میں مضمر ہے اور بس ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی کے جذبات وغیرہ کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے معترضین اگر اس کا مطالعہ کریں گے تو انہیں اپنے خیالات پر ہنسی آئے گی۔ چونکہ ہمارا موضوع ان دیباچوں کے مطالعہ سے آگے کہنے کی اجازت نہیں دیتا ورنہ زبیری صاحب نے اپنی آئندہ کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ علامہ شبلی کیا کسی معمولی شخص کے لیے بھی روا نہیں ہوسکتا اور اسے شبلی کی کردار کشی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

پروفیسر آرنلڈ

علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے استاد پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ (۱۸۶۴۔۱۹۳۰ء) تھے۔ وہ نہ صرف فلسفہ کے بڑے ماہر تھے بلکہ ان کی نظر جدید علوم وافکار پر بڑی گہری تھی، وہ یورپ کی جدید تحقیقات اور انداز تحقیقات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ علی گڑھ میں علامہ شبلی، سرسید کے بعد پروفیسر آرنلڈ کے بہت قریب رہے اور انہیں سے تعلقات اور افادہ واستفادہ نے شبلی کو ان اعتراضات سے واقف کرایا جو یورپ کے اہل قلم اسلام پر کرتے تھے۔

پروفیسر آرنلڈ نے ۱۸۹۶ء میں اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام لکھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے اعترافات کیا ہے کہ شبلی نے ان کی بڑی مدد کی، وہ لکھتے ہیں:

''میں اپنے پیارے دوست شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کا خاص طور پر احسان مند ہوں جنہوں نے اپنے قدیم اسلامی تاریخ کے خزانہ علم سے متواتر مہربانیوں کے ساتھ ہمیشہ میری مدد فرمائی، اگر وہ اپنے اس وسیع علم سے فیاضی کے ساتھ میری مدد نہ کرتے تو اس کتاب کے اکثر حصوں میں جو بیش قیمت واقعات درج ہیں ان سے میں لاعلم رہ جاتا'' (اردو ترجمہ دعوت اسلام، مقدمہ، ص:۲۰)

پروفیسر مظفر علی شہ میری
وائس چانسلر، ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول

عبدالغفور نساخ: حیات اور کارنامے

ابتدائیہ:

عبدالغفور نساخ مرزا غالب کے ہم عصر اور کلکتہ کے صاحبِ طرز شاعر و ادیب گزرے ہیں۔ محمد عادل خان نے ان کی پیدائش کی تاریخ یکم شوال المکرّم ۱۲۴۹ھ مطابق ۳۱ر جنوری ۱۸۳۴ء لکھی ہے۔ نساخ نے محلّہ کلنگا پیروخانسا ماں گلی (موجودہ نواب عبد الرحمٰن اسٹریٹ) کلکتہ میں آنکھیں کھولیں۔(۱) جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے، نساخ بہت کم لکھا گیا ہے۔ مجھے بس دو چار کتابوں ہی کا علم ہوا جن کی روشنی میں یہ کلیدی خطبہ تیار کیا گیا ہے نظر ثانی کے بعد مقالے کی صورت میں ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

خدا کی مرضی کہوں، میں نے نساخ مرحوم کے تعلق سے کبھی کچھ نہ پڑھا تھا اور نہ ہی سنا تھا۔ مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے۔ تاہم ریختہ ڈاٹ کام پر جو کتابیں دستیاب ہیں، میں نے ان کا مطالعہ کیا اور بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ مجھے ذاتی طور پر سوانح عمریاں پڑھنے کا شوق ہے۔ چنانچہ نساخ مرحوم کی سوانح عمری میں نے دل لگا کر پڑھی۔ ان کے کلام اور نثری تحریروں کو بھی بغور دیکھا اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی۔

میں نے ان پر تحریر کردہ دو کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا: ''نساخ سے وحشت تک'' از سید لطیف الرحمٰن اور دوسری ''عبدالغفور نساخ'' از محمد عادل خان۔ ان کے علاوہ ثانی الذکر کتاب میں جن دوسرے لوگوں کے بیانات یا حوالے آئے ہیں انہیں بھی میں نے غور سے پڑھا۔ مجھے لگا کہ نساخ مرحوم کے ساتھ کچھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ مجھے نہ ان کی شخصیت کا تجزیہ صحیح معلوم ہوا اور نہ ہی ان کے فن پر قائم کردہ رائے مناسب لگی۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ نساخ مرحوم کی حیات، شخصیت اور ان کے شعری و نثری فن پاروں پر نظر ثانی کی جائے تو بہتر نتائج ہمارے سامنے آئیں گے اور دنیا نساخ کی ایک نئی اور بدلی ہوئی صورت کا دیدار کرے گی۔ میں نے اسی مفروضے پر اپنے مقالے کی بنیاد رکھی ہے۔

سب سے پہلے ہم نساخ کی شخصیت کا تجزیہ کریں گے۔ سید لطیف الرحمٰن نے انکی شخصیت کے تعلق سے جو رائے قائم کی ہے وہ کافی حد تک متنازعہ فیہ۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''نساخ کی خودنوشت سوانح عمری اور دیگر تصنیفات کے مطالعے سے نساخ کی سیرت کا خوب پتہ لگتا ہے۔ نساخ کی فطرت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ بڑے خود پسند اور خودنما آدمی تھے۔(۲)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''انہوں نے اپنی زندگی کے بہت سارے واقعات مزے لے لے کر بیان کیے ہیں۔ لیکن ہر موقع پر اپنی عالمانہ، عاقلانہ اور شاعرانہ جتانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اگرچہ حقیقت ہے، لیکن اس طرح کہ خوئے خود پسند بے نقاب ہوجاتی ہے''۔(ایضاً)

ان دونوں بیانات سے ان کی شخصیت کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ خود پسندی اور خودنمائی۔ خود پسندی کی بات سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ ان کے اندر احساسِ تفاخر پیدا ہونے کے کئی اسباب تھے۔(الف) پس منظر۔ آپ کا تعلق حضرت خالد بن ولید سے ہے۔ والد ایک کامیاب وکیل اور بڑے بھائی عبداللطیف آئی سی آئی، ڈپٹی مجسٹریٹ، ڈپٹی کلکٹر اور ریاست بھوپال کے وزیر۔(ب) خود کافی ذہین تھے۔ جو علم سیکھنا چاہا سیکھ لیا۔ بسا اوقات بنا کسی دشواری کے سیکھا۔ خط ناخن کا ایک

نمونہ دیکھا اور اپنی ذہانت سے خود سیکھ لیا۔ علم رمل، علم جفر، علم نجوم وغیرہ۔ نساخ مشہور مستشرق اے۔ بی کاول کو اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے بیتال پچیسی پڑھانے کو کہا۔ وہ ناگری رسم الخط سے نابلد تھے۔ وہاں کچھ نہ کہا۔ باہر آ کر لالہ رام چرن مختار جو شطرنج میں ان کے شاگرد تھے، انہیں اپنا حال سنایا۔ موصوف بنگالی رسم الخط کی مدد سے نساخ کو ناگری رسم الخط کے اہم نکات سمجھائے جن کی بنیاد پر انہوں نے رات بھر مشق کی اور دوسرے دن سے کاول صاحب کو بیتال پچیسی پڑھانے لگے۔ (ج) جس عمر میں انہیں ایک استاد کی تلاش تھی، کسی خواجہ نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ (د) بعد کے زمانے میں ان کی پوسٹنگ خطرناک جگہوں پر ہوتی تھی، جسے وہ اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ (ھ) رسل صاحب (بیلی صاحب کے ماتحت اور رجسٹرار) جیسے افسران انہیں ''سروقد تعظیم پیش کرتے تھے۔ تنگ دستی میں بھی پالکی سوار تھے۔ کسی نے انہیں شطرنج نہ آنے کا طعنہ دیا۔ وہ طعنہ سہ نہ سکے۔ شطرنج سیکھی اور مشاہیرِ وقت کے ساتھ بازیاں کھیلیں (۳) ظاہر ہے اس پس منظر کا رکھنے والا شخص خود پسندی ہوگا ہی اور گرنہ ہوتو حیرت کی بات ہوگی۔

مگر جہاں تک خودنمائی کی بات ہے، اس پر تھوڑا سا تامل کرنا پڑے گا۔ اسی لیے محمد حامد علی خان نے اپنی تصنیف عبد الغفور نساخ میں اس بات کو کسی قدر نرم لہجے میں کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نساخ خودنمائی کے بھی عادی تھے، لیکن حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خودنمائی ہے یا حقیقت حال''۔ (۴)

اس کے بعد موصوف نے ان کی رشوت خوری کا ذکر کیا ہے۔ نساخ مرحوم نے اعلان کیا تھا کہ نہ وہ رشوت لیں گے نہ کسی کو رشوت لینے دیں گے۔

محمد حامد علی کی طرح مجھے بھی نساخ کی خودنمائی کو تسلیم کرتے ہوئے تامل ہو رہا ہے۔ کیوں کہ جہاں وہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کو بیان کرتے ہیں وہیں اپنی کمزوریوں کو بلاکم وکاست بیان کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً (الف) ہائی کورٹ جج بیلی صاحب کی سفارش کے باوجود انہیں نوکری نہیں ملتی (ب) نوکری کے لیے عملیات کرتے ہیں اور ناکام ہوجاتے ہیں تو اپنی گھبراہٹ نہیں چھپاتے (ج) اپنی تنگ دستی کا اظہار کرتے ہیں (د) کاول سے پڑھانے کی اجرت پر جو تکرار ہوتی اسے پوشیدہ نہیں رکھتے۔ کسی نے افیون کھانے کے لیے کہا، کھالیا۔ (ھ) کسی سے ناراضگی نہیں چھپاتے۔ مثلاً جناب اخوی صاحب کے تعلق سے نساخ کو یہ بدگمانی تھی کہ وہ ان کی سفارش نہیں کرتے۔ لیکن بعد میں وہ اسے اپنی ناتجربہ کاری گردانتے ہیں (و) وہ کھلے دل سے یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ لوگ انہیں ''غصہ مجسم'' کہتے ہیں (ز) کسی کا پلاو، قورمہ، کباب میٹھے چاول، مٹھائی، اچار وغیرہ کھایا کرتے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا۔ نساخ اس مقدمے کو کسی دوسری عدالت میں بھیج دینا چاہتے ہیں مگر ان کا مقدمہ ان ہی کی عدالت میں آیا۔ چنانچہ جب نساخ ان کے خلاف فیصلہ سناتے ہیں تو انہیں ملزم کی کھلائی ہوئی ساری چیزیں یاد آجاتی ہیں۔ اور وہ اپنا اضطراب نہیں چھپاتے۔ (ح) کسی نے انہیں امتحان پاس کرنے کے لیے انگشتری چاٹنے کے لیے کہا، چاٹ لیا (ط) امتحانات میں کامیابی کے لیے جن توہمات کا سہارا لیا وہ بھی لکھ دیا (ی) انہیں گلے سے خون نکلتا تھا، ایک مرتبہ زیادہ خون نکل آتا ہے تو وہ اپنی گھبراہٹ کو نہیں چھپاتے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ نساخ اگر خودنمائی کے شوقین ہوتے تو وہ آسانی کے ساتھ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈال سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی تمام کمزوریوں کو عوام کے سامنے رکھ دیا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق نہ کریں۔ اور یہ استدلال کریں کہ کمزوریوں کو بیان کرنا بھی خودنمائی ہے۔ یقیناً ہوسکتی ہے مگر ایک بات میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے لہجے میں خودنمائی نہیں ہے۔ وہ بنا کسی لاگ لپیٹ کے بیان کرتے ہیں۔ میرے خیال میں نساخ ایک کھرے انسان

تھے جو دنیا کی پروا کیے بغیر اپنی بات کہہ دیتے تھے۔

سید لطیف الرحمٰن نے ان پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ادبی شہرت حاصل کرنے کے لیے کہا:

''ان کو ادبی شہرت کی بھی خواہش تھی جس کی وجہ سے بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ یہ اسی خواہش کا نتیجہ تھا کہ ''انتخابِ نقص'' لکھ کر اپنے آپ کو لکھنؤ کے اربابِ ذوق کا موضوع بحث بنالیا''۔(۶)

نساخ کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہے۔ کتابوں کی تصنیف کی وجہ ''شہرت'' لکھنا صحیح نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی عمل کی کوئی ایک وجہ ہی ہو۔ فنکار کی شخصیت بڑی گہری اور تہہ دار ہوتی ہے، اسے کسی ایک خانے میں بند کرنا کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے۔

سید لطیف الرحمٰن نے نساخ کی شخصیت کی ایک اور خرابی یہ بتائی ہے:

''ان کی فطرت کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ جس آدمی کو پسند کرتے تھے، اسے خوب بڑھاتے تھے اور جسے ناپسند کرتے تھے اسے بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔(۷)

اس کے بعد لطیف الرحمٰن نساخ کی اہلِ دہلی سے محبت اور اہلِ لکھنؤ سے ان کی نفرت کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی آدمی کے اندر انتہا پسندی ہو لیکن جو مثالیں انہوں نے دی ہیں، مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ اہلِ دہلی سے کیوں محبت کرتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ سے کیوں نفرت؟

مجھے اس سلسلے میں دو باتیں عرض کرنی ہیں۔

(۱) جہاں کہیں بھی ان کا تبادلہ ہوا نساخ نے وہاں کے پیڑ پودوں پھل پھول جانور چرند پرند اور باکمال لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور انہیں اپنی سوانح حیات درج کیا۔ ان میں سے جو کچھ انہیں پسند آیا اس کی کھل کر تعریف کی اور میرے خیال میں یہ ایک فطری عمل ہے۔

(۲) ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے لوگوں ہی کی تعریف کی ہے انہوں نے ایک چپراسی کی بھی تعریف کی:

''چرنجیت چپراسی قوم کا بھاٹ تھا۔۔۔ستر برس کی عمر کا تھا لیکن بڑا ہوشیار اور مظبوط تھا اور کام اس قدر جلد کرتا تھا کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔۔۔ بھاگل پور تک کے چودہ کوس کا فاصلہ ہے۔ رات کو تنہا جاتا تھا اور شیر اور ریچھ سے ڈرتا نہ تھا کہ شیر اور ریچھ راستے میں بہت تھے''۔(۸)

ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ لوگوں کے کمالات کا کھل کر ذکر کرتے ہیں اور اپنے ناپسندیدہ لوگوں کی خامیوں کو بطور کلیے کے پیش کرتے ہیں نہ کہ کسی خاص آدمی کی برائی بیان کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیکیوں کو پسند کرتے ہیں اور بدی سے بھاگتے ہیں۔ مجھے محمد حامد علی خان کا یہ قول یہاں دہرا دینا چاہئے:

''سید لطیف الرحمٰن اور محمد خالد عابدی نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں وہ غالباً سہل پسند تحقیق کا نتیجہ ہیں''۔(۹)

میں اس پر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نہ صرف سہل پسند تحقیق کا نتیجہ ہیں بلکہ غیر ذمے دار تجزیے بھی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ نساخ مرحوم کی شخصیت کا دوبارہ مطالعہ کرنا چاہئے۔ خاص طور پر کسی ماہرِ نفسیات سے کروانا چاہئے۔ یا ان کا نفسیاتی مطالعہ ہونا چاہئے۔ میں نے یہاں ایک ہلکا سا نفسیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

نساخ مرحوم ایک متضاد شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے اندر تضاد بہت تھا

وہ شراب نہیں پیتے تھے	مگر	رقص شوق سے دیکھتے تھے
رشوت سے سخت پرہیز تھا	مگر	اپنے لیے بڑے لوگوں سے سفارش کرواتے تھے
اللہ پر کامل ایمان رکھتے تھے	مگر	تعویذ گنڈوں پر مکمل یقین رکھتے تھے
صوم وصلاۃ کے پابند تھے	مگر	نمازیں اور روزے کئی کئی دنوں تک ترک کر دیتے تھے

بلا کے ذہین تھے مگر توہمات کے شکار بھی تھے

شخصیت کے اسی تضاد کو عبدالسبحان نے یوں بیان کیا ہے:

'' In the light of auto bigraphy Nassakh appears as a man of colourful personality"

(۱۰)

شخصیت کے اس تضاد نے انہیں انتہا پسند بنا دیا۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے خاص طور پر ان کے بچپن اور لڑکپن کے واقعات معلوم ہوں تو ان کی شخصیت کا صحیح تجزیہ کیا جاسکتا ہے ورنہ خلا میں باتیں کرنے سے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

شاعری کا تنقیدی مطالعہ

میرا خیال ہے کہ ہم نسآخ کی شاعری کا مطالعہ ان کے زمانے کے اس اقدارِ شعروشاعری کے پس منظر میں کریں گے تو ہم شاعر کے ساتھ انصاف کرسکیں گے۔ ورنہ بے جا نکتہ چینی کے شکار ہوجائیں گے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اگلے زمانے میں شاعری انفرادی عمل ہونے کے باوصف ایک اجتماعی عمل بھی تھا۔ وہ اس طرح کہ شاعر کے سامنے کچھ روایتی چیلنج ہوتے تھے، جنہیں وہ قبول کرتا تھا۔ جو شاعر ان چیلنجوں میں جیت جاتا وہ استاد شاعر کہلاتا تھا۔ مثلاً ایک چیلنج یہ تھا کہ فلاں استاد کے رنگ میں شعر کہہ کر دکھائیں یا کسی زمین میں زیادہ سے زیادہ شعر نکال کر دکھائیں وغیرہ۔ چنانچہ اس خصوصی میں زود گوئی اور بسیار گوئی دونوں راہ پاگئیں۔ نساخ نے ان چیلنجوں کو قبول کیا اور شاعری کے اچھے برے نمونے پیش کیے۔ لطیف نے لکھا ہے:

''نساخ بڑے زود گو اور پر گو واقع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ زیادہ سے زیادہ شعر کہنے کا چسکا''۔(۱۱)

ایک اور جگہ لکھا ہے:

''زیادہ سے زیادہ شعر کہنے کو بھی اپنا کمال تصور کرتے تھے۔ دوغزلہ، سہ غزلہ، چوغزلہ بلکہ پنج غزلہ اور شش غزلہ بھی کہتے تھے''۔

مزید لکھتے ہیں:

پھر یہ بھی التزام ہوتا تھا کہ کوئی قافیہ چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن ایک قافیہ مکرر سہ مکرر بھی آتا تھا۔ اس سے بھی طبیعت سیر نہ ہوئی تو صرف قافیہ یا صرف ردیف بدل کر پھر اسی زمین میں غزل کہنے لگے''۔ خود فرماتے ہیں:

سو سو طرح سے باندھے ہیں مضمون زلف یار
ہاتھوں سے میرے قافیے ہیں ایک عذاب میں

سنگلاخ زمینوں کا شوق:

''بعض دفعہ ردیفیں اتنی سنگلاخ ہوتی تھیں کہ ایک شعر بھی کام کا ہوتا نہ تھا۔ مثلاً تنویرِ شعاع آفتاب، توقیر شعاع آفتاب، تحریر کا پیچ، تقدیر کا پیچ، یار کج، مے خوار کج، ۔۔۔ دلدار کی پازیب کی جھنکار، دلدار کی پازیب کی جھنکار، ۔۔۔۔۔''(ایضاً)

یہ بھی اس زمانے کی ایک روایت چیلنج کی صورت میں موجود تھی کہ شاعر کسی استاد کے رنگ میں شعر کہہ کر دکھائے۔ چنانچہ یہ نساخ نے بھی یہی کیا۔ مومن کے رنگ تو کبھی داغ کے اور کبھی غالب کے رنگ میں غزلیں کہیں۔ داغ کے رنگ کے یہ دو شعر بطور نمونہ پیش ہیں:

چھٹے کب بوسۂ لب کا لپکا
تم کو دشنام کی عادت ہی سہی

ہوئے بزم اعدا میں وہ بے حجاب
کرشمہ ہے یہ بادۂ ناب کا

مضمون سے مضمون نکالنا اردو شاعری کی روایت رہی ہے اور ایک چیلنج بھی۔ نساخ کی بیشتر غزلیات میں یہ روایت دیکھی جاسکتی ہے۔ اس خصوص میں کچھ عمدہ شعر مثلاً

بخدا بیٹھ رہو بزم میں ہرگز نہ اٹھو
ورنہ کہتے ہیں کہ ہنگامہ محشر ہوگا

سونے کے مول بکتی ہے زنجیرِ آہنی
آیا ہے اے پری جو یہ موسم بہار کا

میں ہوں چراغِ طور جلوے کا سوختہ
ہر ذرہ آفتاب ہے میرے غبار کا

کہیں کہیں اشعار میں ندرت بھی نظر آجاتی ہے:

جلوہ دکھا کے پردہ نشیں
نقشِ دیوار کردیا ہم کو

زلفِ پے چاں سے کبھی خم نہ جائیں گے۔ مگر اس کا وصف بیان کرنے والا قلم سیدھا ہوسکتا ہے:

ہے سرگرم وصفِ پیچاں
قلم آج سیدھا ہوا چاہتا ہے

ان اشعار میں اردو غزل کے کئی مضامین کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر نے اپنے زمانے کے رجحان کی کامیاب پیروی کی ہے۔

نساخ کے ہم عصر شعراء اور ناقدوں نے ان کے کلام پر جو تنقید کی ہے وہ بھی اپنے زمانے کے اعتبار سے کی ہے۔ اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جو تنقید کی گئی ہے اس میں شاعر سے انتقام کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً مولوی آغا علی کا لہجہ دیکھیے:

''دیکھیے بنگالی زبان کا اثر نہ گیا۔ واحد جمع اور جمع کو واحد بولنا اس زبان کا حصہ ہے۔ پہلے مصرعے میں ''دیکھیے'' فعل اور دوسرے میں ''شب ہائے ہجراں'' جمع۔ اس پر دعوائے زبان دانی لکھنؤ کے افصح لوگوں پر اعتراض۔ زہے خیرگی''۔ (لطیف، ص:۵۱)

اس کا جواب لطیف نے دیا ہے، مگر یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ نساخ پر بعض اعتراضات نکتہ چینی اور تنقید برائے تنقید د کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسی طرح سید مرتضی گستاخ کی تنقید بھی تنقید برائے تنقید لگتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہم نساخ کے کلام کا مطالعہ ازسرِ نو کریں۔

ذیل میں نساخ کی شاعری کی کچھ اہم خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نساخ نے اردو غزل کی اہم روایات کو بڑی عمدگی سے نبھایا ہے۔ عظمتِ عشق پر یہ اشعار دیکھیے:

ظاہراً موت ہے قضا ہے عشق
پر حقیقت میں جاں فزا ہے عشق
تادم مرگ ساتھ دیتا ہے
ایک محبوبِ باوفا ہے عشق
دیکھ نساخ گر نہ ہوتا کفر
کہتے بے شبہ ہم خدا ہے عشق

نساخ کے وہ شعر جن میں ان کے دل کی تڑپ سما گئی ہے، بڑے پر تاثیر ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

پیری میں شوق حوصلہ سا نہیں رہا
وہ دل نہیں رہا وہ زمانہ نہیں رہا
نہ دیا دل اسے جو ظلم پہ مائل نہ ہوا
اس کو چاہا نہ کبھی مجھ سے جو غافل نہ ہوا
بزم جاناں میں رقیبوں کے اشارے دیکھے
اب تو ارمان ترا اے دلِ ناداں نکلا

غزل میں شوخی نہ ہو تو محبوب کو چھیڑنے کا مزا ہی نہ ہو: نساخ

مستی میں رات وہ نہ کھلے مجھ سے ہم نشیں
کچھ اعتبارِ نشّہِ صہبا نہیں رہا
لکنت کے ساتھ وصل سے انکار دیکھنا
وہ نشہ میں بھی کیسے ہیں ہشیار دیکھنا

نساخ بڑی بے باک گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کی غزل میں بھی یہ رنگ دکھائی دیتا ہے: چند شعر دیکھیے:

کاٹ ڈالو اگر زباں پہ مرے
حرف آیا ہو آشنائی کا
کیوں بہر سیر آنے لگے گل رخاں دہر
پیری میں دل سزائے تماشا نہیں رہا
مسجد میں گر گزر نہ ہو اک سیر ہی سہی
بے کار بیٹھے کیوں رہیں اک سیر ہی سہی

شاعرانہ تعلّی اور غزل کی اہم روایت رہی ہے۔ نساخ:

سچ سچ جو مجھ سے پوچھیے تو فن شعر میں

نساخ اپنے وقت کے تم بھی امام ہو
نساخ کی غزل پہ غزل کون کہہ سکے

کیوں کر جواب ہو سخنِ لاجواب کا
مرگئے غالب وآزردہ رہا ہے اک تو

ذات نساخ بہت اب ہے غنیمت تیری
میرے اشعار کو سن کر نساخ

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

شعر کی برجستگی شعر کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔نساخ:

جلوۂ طور نے مارا
دلِ خاکی کو نور نے مارا

گردشِ روزگار کے غمزے
گردشِ روزگار کیا جانے

نساخ کی غزل میں جہاں روایتی مضامین کی بھرمار وہیں مضامین کے نئے پہلو یا نئے نکتے دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثلاً: اردو غزل میں آسمان کو دشمن تصور کیا جاتا ہے۔نساخ نے ایک نیا پہلو نکالا ہے:

مرنے کے بعد بھی ہوں کیوں عذاب میں
کچھ قبر میں تو سر پہ مرے آسماں نہیں

ساکنانِ فلک بھی عشق میں گرفتار ہیں۔داغ ماہ کی توجیہ:

خالیں ہیں ساکنانِ فلک عشق سے اگر
پھر داغ کس لیے ہے دلِ ماہتاب میں

پائے خیال کو زنجیر نہیں پہنائی جاسکتی :

آزاد قیدِ دہر سے رہتے ہیں سربلند
زنجیر پڑتی ہے کہیں پائے خیال میں

نساخ نے اسی طرح روایتی تشبیہات میں نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔چیدہ چیدہ چندہ شعر ملاحظہ کریں:

زخم بھرتا نہیں سینے کا مرے رونے سے
داغ لالے کا نہ ہو دور کبھی دھونے سے

وہ بہارِ حسن اگر نا مہرباں ہوجائے گا
حال اپنا صورتِ برگِ خزاں ہوجائے گا

میرے ہی واسطے رکھا ہے امانت کی طرح
آج تک چرخ سے جو فتنہ نازل نہ ہوا

ان اشعار میں تشبیہ کی تاثیر کے ساتھ ساتھ دردِ دل کی کسک بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔نساخ کے نکھرے ہوئے اسلوب بیان کو اجاگر کرتے ہوئے ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے:

جس نے تری بے باک ادا کو نہیں دیکھا
واللہ کہ آنکھوں سے قضا کو نہیں دیکھا

گھبرائی ہوئی پھرتی ہے کیوں میری طرح سے
تاثیر نے کیا روئے دعا کو نہیں دیکھا

ساتوں یہ دلفریب ہیں دل کس کو دیجے
ابرو، مژہ، نگاہ، جبیں، زلف، خال، خط

ان کے دامن سے الجھتا ہوں جو میں
صورتِ خار چھڑاتے ہیں مجھے

نساخ کی غزل کی یہ چند خصوصیات انہیں اردو شاعری میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے فنی شاعری کو ان کے زمانے کے حوالے سے سمجھا جائے اور بے جا تعصب سے بلند ہوکر سوچا جائے۔

حواشی وتعلیقات:

(۱) عبدالغفور نساخ،ص:۷۔محمد عادل خاں۔ساہتیہ اکاڈمی دہلی۔
(۲) نساخ سے وحشت تک،ص:۲۷۔سید لطیف الرحمٰن
(۳) خودنوشت سوانح عمری صفحات:۲ تا ۵، ۸، ۲۶، ۲۷، ۳۰
(۴) عادل خان،ص:۱۹
(۵) خودنشت سوانح عمری بالترتیب:۱۵، ایضاً، ۱۷، ۴۰، ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۵۸، ایضاً ۹۳
(۶) نساخ سے وحشت تک،ص:۳۰
(۷) ایضاً،ص ۲۷
(۸) خودنوشت سوانح عمری،ص ۱۱۳
(۹) عادل خاں،ص ۱۱
(۱۰) بحوالہ محمد حامد علی خاں،ص:۱۷
(۱۱) نساخ سے وحشت تک،ص:۵۵

محمد انور داؤدی
اعظم گڈھ، یوپی

اور ہندوستان آزاد ہو گیا

اسی مہینہ کی 15/تاریخ کو پورا ملک 72/ویں یوم آزادی کے جشن میں ڈوبنے والا ہے، اس حوالے سے میں نے اپنی گفتگو کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے (1) ملک ہندوستان کا تعارف (2) انگریزوں کی آمد اور تسلط سے لے کر آزادی تک اور اس میں مسلمانوں کی جدوجہد (3) آزادئ وطن کے بعد ملک کے حالات اور مسلمانوں کی حکمت عملی (4) ملک کی موجودہ صورت حال حکومت، حالات اور اندیشے (1) میرے خوبصورت ملک ہندوستان کا تعارف۔ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اسے کئی ناموں سے جانا جاتا ہے۔ جیسے بھارت، ہندوستان، انڈیا، آریہ ورت۔ ہندوستان کی شکل ایک جزیرہ نما کی ہے، اتر میں ہمالیہ اور قراقرم پہاڑ ہے، دکھن میں بحر ہند، مغرب میں بحر عرب اور مشرق میں خلیج بنگالہ ہے۔ نیپال، بھوٹان، چین، سری لنکا، بنگلہ دیش، میانمار اور پاکستان، یہ وہ ممالک ہیں جو ہندوستان کی سرحدوں سے ملحق ہیں۔ ہندوستان رقبہ کے حساب سے دنیا میں ساتویں نمبر پر ہے اس کا کل رقبہ 3287263 کلومیٹر ہے، ملک کی کل آبادی 2011/کی رائے شماری کے مطابق ایک عرب اکیس کروڑ ایک لاکھ ترانوے ہزار چار سو بائیس ہے (1210193422)۔ ہمارے ملک ہندوستان کا قومی پرچم ترنگا یعنی تین رنگ کا ہے، زعفرانی رنگ، ہمت وقربانی پر دلالت کرتا ہے، سفید رنگ، زندگی کے پاک، بیلوث اور پرامن ہونے کا اشارہ کرتا ہے، ہرا رنگ، ملک کی زرخیزی پر دلالت کرتا ہے اور بیچ میں گول چکر، زندگی کے رواں دواں ہونے اور ترقی کا پتہ دینے پر دال ہے۔

قومی کرنسی کا نام روپیہ ہے، نوٹوں اور سکوں پر تین شیر نظر آتے ہیں وہ اشوک استمبھ ہے، جو الہ آباد میں سنگم کے قریب منٹو پارک میں موجود اشوک کی لاٹ سے لیا گیا ہے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ خونخوار جانور آپس میں کس طرح ملکر رہتے ہیں اسی طرح ہمارے ملک میں مختلف نسل ومذاہب کے لوگ مل جل کر باہم زندگی گزارتے ہیں۔ اس ملک میں مختلف افکار وخیالات کے لوگ بستے ہیں اور سب کو آئینی اعتبار سے آزادی حاصل ہے یہی تنوع اور رنگارنگی اس ملک کی خوبصورتی اور پہچان ہے، یہ الگ موضوع ہے کہ عمل میں تعصب کا شکار ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے آنے سے بہت پہلے یہاں مسلمان آباد ہو چکے تھے۔ عرب وہند کے تعلقات انتہائی قدیم ہیں۔

قومی زبان ہندی اور قومی گیت جن گن من ہے۔

انگریزوں کی آمد اور آزادی کی جدوجہد

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں دو دن انتہاء اہمیت کے حامل ہیں، ایک 15/اگست جس میں ملک انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوا۔ دوسرا 26/جنوری جس میں ملک جمہوری ہوا یعنی اپنے دیس میں اپنا قانون نافذ اور لاگو ہوا۔ ملک پر قابض وجابر انگریزی سلطنت بہت بڑی طاقت تھی اس کے خلاف مورچہ کھولنا، علم بغاوت بلند کرنا اور ملک چھوڑو کی تحریک چلانا موت کو دعوت دینا تھا اور سچائی بھی یہی ہے کہ آج بہار اور جشن کے یہ دو دن ایک دو انگلی کٹا کر نہیں ملے، ایک دو سال احتجاج کر کے نہیں ملے اگر آپ 1857/کی بغاوت سے تاریخ کا حساب کریں گے تب بھی 1947/تک 90/سال بنتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ 18/ویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال سے انگریزوں کو عروج ملا مگر انگریزوں

کا پہلا جہاز 1601 / میں دور جہانگیری میں ہی آچکا تھا اس حساب سے ہندوستان جنت نشان سے انگریزوں کا انخلاء 47 / میں 346 / سال بعد ہوا، اس دوران ظلم و بربریت کی ایک طویل داستان لکھی گئی جس کا ہر صفحہ ہندوستانیوں کے خون سے لت پت ہے، جذبہ آزادی سے سرشار اور سر پر کفن باندھ کر وطن عزیز اور اپنی تہذیب کی بقاء کیلئے بے خطر آتش افرنگی میں کودنے والوں میں مسلمان صف اول میں تھے، جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانی الگ کردیں گے تو ہندوستان کبھی آزاد نہ ہوگا ۔1498 / میں پرتگال (یورپ) والے ایک عربی ملاح "واسکوڈی گاما" کی مدد سے پہلی مرتبہ بحری راستے سے ہندوستان پہنچے اور کلکتہ سے اپنی تجارتی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور ایک عرصے تک خوب منافع کمایا، ان کی دیکھا دیکھی یورپ کے دوسرے ممالک مثلاً ہالینڈ، اور انگلستان والوں نے بھی ہندوستانی دولت لوٹنے کا پلان تیار کیا، چنانچہ انگلستان کے 101 / تاجروں نے 30 / ہزار پونڈ (انگریزی روپیہ) جمع کرکے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے ایک کمپنی بنائی اور 1601 / میں ان کا پہلا جہاز ہندوستان آیا۔اس وقت ہندوستان میں جہانگیر بادشاہ کی حکومت تھی (یہ اکبر بادشاہ کا لڑکا تھا اس کا اصل نام سلیم نورالدین اور لقب جہانگیر تھا، اس نے انگریزوں کا خیر مقدم کیا لیکن انگریزوں کو باقاعدہ تجارت کی اجازت جہانگیر کے دوسرے لڑکے شاہ خرم (شاہجہاں) نے دی، رفتہ رفتہ اس کمپنی نے تجارت کی آڑ میں اپنی فوجی طاقتوں میں اضافہ کرنا شروع کیا (یعنی مال کی جگہ ہتھیار اور ملازم کی آڑ میں فوجیوں کی آمد) لیکن مرکز میں مغلیہ سلطنت اس قدر مضبوط تھی کہ انگریزوں کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، شاہجہاں کے دوسرے لڑکے اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی، اٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کی عظمت کا سکہ کمزور ہوتے ہی طوائف الملو کی کا دور شروع ہوگیا ۔عیار اور شاطر انگریزوں نے پورے ملک پر قبضے کا پلان بنالیا، ہندوستانیوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کا منصوبہ طے کرلیا انکے خطرناک عزائم اور منصوبے کو بھانپ کر سب سے پہلے میدان پلاسی میں جس مرد مجاہد نے انگریزوں سے مقابلہ کیا اور 1757 / میں جام شہادت نوش کیا وہ شیر بنگال نواب سراج الدولہ تھا، پھر 1799 / میں سرنگا پٹنم میں انگریزوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے شیر میسور سلطان ٹیپو نے ملک پر جان قربان کردی، جس کی شہادت پر انگریز فاتح لارڈ ہارس نے فخر و مسرت کیساتھ اعلان کیا تھا کہ '' آج ہندوستان ہمارا ہے۔واقعہ انکے مقابل اب کوئی اور نہیں تھا دہلی تک راستہ صاف تھا 1803 / میں انگریزی فوج دہلی میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئی اور بادشاہ وقت "شاہ عالم ثانی "سے جبراً ایک معاہدہ لکھوایا کہ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا"۔یہ بات اس قدر عام ہوگئی کہ لوگ کہنے لگے۔''حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم''۔

یہ معاہدہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ ہندوستان سے اب اسلامی اقتدار ختم ہو چکا ہے، وحشت و بربریت، ظلم وستم کی گھنگور گھٹائیں پوری فضا کو گھیر چکی ہیں، اب وطنی آزادی اور مذہبی شناخت ان کے رحم وکرم پر ہوگی احساس سب کو تھا مگر امراء اپنی بچی کھچی نوابی بچانے کیلئے اور عوام اپنی جان بخشی کیلئے خاموشی میں عافیت سمجھے تھے ایسے بھیانک ماحول اور پرفتن حالات میں ایک بوریہ نشیں فقیر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بیٹے شاہ عبدالعزیز دہلوی نے پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ فتوی جاری کیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے، یعنی اب ملک غلام ہو چکا ،لہٰذا بلاتفریق مذہب وملت ہر ہندوستانی پر انگریزی تسلط کیخلاف جہاد فرض ہے۔اس فتوی کے بعد شاہ صاحب نے اپنے معتقد خاص حضرت سید احمد بریلوی کو نواب امیر خان (جو انگریزوں کیخلاف متحدہ محاذ قائم کئے تھے) کی فوج میں شامل ہونے کا حکم دیا جہاں سید صاحب 7 / سال رہے پھر دہلی واپسی ہوئے ۔شاہ صاحب کے فتوی کی روشنی بڑے بڑے علماء کی مشاورت میں ایک جماعت بنائی گئی جس

کا مقصد عوام میں دینی بیداری پیدا کرکے انقلاب کا ماحول بنانا تھا۔ چنانچہ 1818/ میں سید احمد کی قیادت اور شاہ اسماعیل کی موجودگی میں پہلا قافلہ دہلی سے روانہ ہوا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے روانگی کے وقت اپنے ہاتھ سے اپنی سیاہ دستار اور اپنا سفید کرتا حضرت سید احمد کو پہنا کر سفر کی اجازت دی ،ان لوگوں نے پورے ملک کا دورہ کرکے قوم کو جگایا اور ہر طرف آزادی کی آگ لگادی اور 1831/ کو بالاکوٹ کی پہاڑی پر لڑکر جام شہادت نوش کیا۔ دھیرے دھیرے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف ماحول بننے لگا، انگریزوں کے مظالم کوئی ڈھکے چھپے نہ تھے۔ چنانچہ میلکم لوئین جج عدالت عالیہ مدراس وممبر کونسل نے لندن سے اپنے ایک رسالہ میں ظلم وبربریت پر لکھا تھا کہ ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا انکے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم ورواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں، سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، امراء کی ریاستیں ضبط کرلیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا، انہیں تکلیف دیکر مال گزاری وصول کی، سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کرکے انہیں آوارہ گرد بنادینے والے بندوبست قائم کئے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 110)

1857/ میں پھر دہلی کے چونتیس علماء نے جہاد کا فتوی دیا جس کی وجہ سے معرکہ کارزار پھر گرم ہوگیا۔ دوسری طرف انگریزی فوجیں پورے ملک میں پھیل چکی تھیں اور ہندوستان سے مذہبی بیداری وسرگرمی ختم کرنے کیلئے انگریزوں نے بے شمار عیسائی مبلغین (پادری) کو میدان میں اتار دیا تھا جسے انگریزی فوج کی پشت پناہی حاصل تھی جو جگہ جگہ تقریریں کرتے اور عیسائیت کا پرچار کرتے، اسی دوران یہ خبر گشت کرنے لگی کہ انگریزی حکومت نے ہندو مسلم کا مذہب خراب کرنے کیلئے اور دونوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کیلئے آٹے میں گائے اور سور کی ہڈی کا برادہ ملادیا ہے، کنویں میں گائے اور سور کا گوشت ڈلوادیا ہے تاکہ پانی ناپاک ہوجائے اور ہندو مسلم آپس میں لڑجائیں اسکے علاوہ یہ بات چرچے میں آگئی کہ انگریزی فوج میں استعمال ہونیوالے کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی ملادی گئی ہے اور ہر فوجی کو وہ کارتوس منھ سے کھولنا لازم ہے ان واقعات نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی ایک آگ لگادی، انگریزوں کی ان مذہب مخالف پالیسیوں کی وجہ سے انگریزی فوج میں ملازم ہندو مسلم سب نے زبردست احتجاج کیا، کلکتہ سے یہ چنگاری اٹھی اور دھیرے دھیرے بارک پور، انبالہ لکھنو، میرٹھ، مرادآباد اور سنبھل وغیرہ تک پہنچتے پہنچتے شعلہ بن گئی۔ احتجاج کرنیوالے سپاہی اور انقلابی منگل پانڈے اور انکے ساتھیوں کو پھانسی دیدی گئی، اور جہاں جہاں احتجاج ہوا اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے سخت قوانین بنادئے گئے، احتجاجیوں کی بندوقیں چھین لی گئیں، وردیاں پھاڑ دی گئیں، قید بامشقت کی سزائیں سنائی گئیں، جسکی وجہ سے عوام وخواص میں سخت اشتعال پیدا ہوگیا ہندو مذہب مخالف پالیسی کی وجہ سے ہندوؤں کی رہنمائی پنڈٹ کررہے تھے اور مسلم مذہب مخالف پالیسی کیوجہ سے مسلمانوں کی رہنمائی علماء کررہے تھے، ہندو مسلم مشترکہ جلسہ کرتے اسی دوران شاہ جہاں پور میں مفتی مظہر کریم کے گھر پر یکم مئی 57/ کو جلسہ ہوا جس میں ہندو مسلم دونوں شریک ہوئے، انقلابی تقریریں ہوئیں نعرے لگے اور پورے ملک میں ایک ساتھ بغاوت کا منصوبہ بنا۔ دوسری طرف 1857/ میں ہی جبکہ ہر طرف بغاوت کی لہر پھوٹ چکی تھی، تھانہ بھون کے مشہور رئیس قاضی عنایت علی کے بھائی قاضی عبدالرحیم اپنی ضرورت سے ہاتھی خریدنے کیلئے سہارنپور گئے تھے کسی نے انگریزوں کو مخبری کردی کہ یہ بغاوت کیلئے ہاتھی خرید رہے ہیں چنانچہ انھیں گرفتار کرکے پھانسی پر لٹکادیا گیا جس سے پورے تھانہ بھون میں بھی کھلبلی مچ گئی اور نفرت کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی ، لوگ جہاد کیلئے

ادھرادھر سے آکر حاجی امداداللہ مہاجرمکی کے ہاتھ پر بیعت ہونے لگے اوران کی قیادت میں انگریزوں سے مقابلہ کیلئے بیتاب ہوگئے بانی دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار متعین ہوئے، مولانا رشیداحمد گنگوہی دائیں، مولانا منیراحمدصاحب بائیں بازوکے افسرمقررہوئے ،سہارنپور سے شاملی توپ خانہ جارہاتھا مولانا رشیداحمد گنگوہی نے ساتھیوں کی ساتھ رات میں حملہ کیااورانگریزوں سے چھین لیا، صبح میں شاملی میں انگریزوں کی ایک فوجی چھاؤنی پرحملہ کیا گیالیکن حافظ ضامن صاحب کی شہادت نے کایاپلٹ دی اورناکامی ہاتھ لگی۔دوسری طرف جگہ جگہ بغاوت پھوٹنے کے بعدزیادہ تر انقلابی فوجیوں نے دہلی کارخ کیااورجنرل بخت خان کے ساتھ ملکر پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ دہلی شہراورمغلیہ حکومت کادفاع کرتے رہے، ناناصاحب،تاتیاٹوپے،رانی لکشمی بائی،رانابینی مادھو سنگھ وغیرہ بھی پیش پیش تھے ،مگرانگریزوں کی منظّم فوج کے سامنے بغاوت ناکام ہوگئی اور انگریزوں نے 20/ستمبر1857/کولال قلعہ پر باقاعدہ قبضہ کرلیااورسلطنت مغلیہ کے آخری چراغ بہادرشاہ کوگرفتار کرکے رنگون (برما) جلاوطن کردیا گیا۔

ستاون کی بغاوت جسے انگریزوں نے غدرکانام دیاتھااوراپنےظلم وبربریت پر پردہ ڈالنے کیلئے بغاوت کاالزام انھیں ہندوستانیوں پرلگادیااوربغاوت ناکام ہونے کے بعدانگریزوں نے ہندوستانیوں پرظلم وستم کی جوبجلیاں گرائی ہیں(الامان والحفیظ)

سرسیداحمدخان نے ایک رسالہ"اسباب بغاوت ہند" لکھ کرحکام گورنمنٹ کوآئینہ دکھایا۔بہرحال چونکہ اب تک انگریزوں سےلوہالینے میں مسلم علماءاورعوام صف اول میں تھے اس لئے بدلہ بھی ان سے خوب لیا گیا،مولویت بغاوت کے ہم معنی قراردیدی گئی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے یہ حکم جاری کیا گیاتھا کہ لمبی داڑھی اور لمبے کرتے والے جہاں ملیں تختہ دار پر چڑھادیاجائے، قتل وپھانسی کا یہ سلسلہ تقریباًدوہفتہ چلتارہا،ہزاروں جانبازوں کوبیدردی کیساتھ قتل کیا گیا۔مفتی سلمان منصورپوری صاحب نے''تحریک آزادی میں مسلم علماء اورعوام کا کردار'' نامی کتاب میں قیصرالتواریخ کے حوالے سے لکھاہے کہ دہلی پرقبضہ کے بعد 27/ہزارافرادکوپھانسی پرلٹکایا گیااورمولانااسیرادروی صاحب نے ایک انگریزمصنف کے حوالے سے لکھاہے کہ چاندنی چوک ہی نہیں بلکہ شہر کے ہرچوراہے پرسولیاں نصب کردی گئیں،جوبھی معززمسلمان ملے پھانسی پرلٹکادیا گیا،زمین پرلٹاکرآرے سے چیرا گیا،سورکی چربی لگاکر جلتے ہوئے تندوروں میں پھینکا گیا،ہاتھیوں کے پیروں سے باندھ کرمخالف سمت ہانک دیا گیا،توپ کے منہ پر باندھ کرتوپ چلادی گئی جس سے جسم کے پرخچے اڑجاتے۔

ایک ہندومؤرخ میوارام گپت کے بقول ایک اندازے کے مطابق1857/میں پانچ لاکھ مسلمانوں کوپھانسیاں دی گئیں ۔ایڈورڈ ٹائمس کی شہادت ہے کہ صرف دہلی میں500/علماء کوتختہ دار پرلٹکایا گیا

(ابھی تک گاندھی جی یا کانگریس کاوجودنہیں ہے کیونکہ گاندھی جی1869میں پیداہوئے تھے)

30/مئی1866/کواکابرین امت اوربچے کھچے مجاہدین نے دیوبندمیں ایک مدرسہ کی بنیادڈالی جوآگے چل کردارالعلوم دیوبندکےنام سےمشہورہوا۔ 1878/ میں اسی درسگاہ کے ایک فرزندمولانامحمودحسن دیوبندی نے (جوآگے چل کرشیخ الہندکے نام سےمشہورہوئے انگریزوں کے لئےمسلسل دردسربنے رہے۔

تحریک ریشمی رومال

یاتحریک شیخ الہندبزبان حکومت برٹش ریشمی خطوط سازش کیس انہیں کی پالیسی کاحصہ تھی) ثمرہ التربیت کے نام سے یک انجمن قائم کی جس کامقصد انقلابی مجاہدین تیارکرناتھا1885/میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیادڈالی

گئی، کچھ عرصہ کے بعد لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک نے سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے کا نعرہ بلند کیا اور 1909/ میں جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی جس کے پہلے ناظم مولانا عبیداللہ سندھی منتخب ہوئے اور 1911/ یا 12/ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال اخبار کے ذریعہ آزادی کا صور پھونکا۔ 1915/ میں ریشمی رومال کی تحریک چلی 1916/ میں ہندو مسلم اتحاد کی تحریک چلی اور 1919/ میں دہلی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا اور اسی جلسے میں باضابطہ جمعیۃ علماء ھند کی تشکیل ہوئی جس کے پہلے صدر مفتی کفایت اللہ صاحب منتخب ہوئے۔ 1919/ میں ہی امرتسر کے جلیاں والا باغ کے ایک جلسے میں انگریزوں کی فائرنگ سے ان گنت ہندو مسلم کا خون بہا۔ 1920/ میں حضرت شیخ الہند نے ترک موالات کا فتوی دیا جسے مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد بہاری نے مرتب کر کے جمعیت کی طرف سے شائع کیا۔ 1921/ میں مولانا حسین احمد مدنی نے کراچی میں پوری جرأت کی ساتھ اعلان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی اعانت اور ملازمت حرام ہے۔ 1922/ میں ہندو مسلم اتحاد ختم کرنے کیلئے انگریزوں نے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع کیں جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات پھوٹے۔ 1926/ میں کلکتہ میں جمعیت کے اجلاس میں جس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے کی، مکمل آزادی کی قرارداد منظور ہوئی۔ 1929/ اور 30/ میں گاندھی جی نے ''ڈانڈی مارچ اور نمک ستیہ گرہ (نمک سازی تحریک)'' چلائی۔ 1935/ میں حکومت ہند کا ایک دستور بنایا گیا تھا جس میں کچھ اختیارات ہندوستانیوں کو سونپے گئے تھے اسی میں مدنی فارمولا پیش کیا گیا تھا اور الیکشن کا پاور ملا تھا لیکن مذہب کو بنیاد بنایا گیا یعنی ہندو صرف ہندو امیدوار کو اور مسلم صرف مسلم امیدوار کو ووٹ دے گا۔ یہیں سے انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کی مضبوط دیوار میں سیندھ لگائی اور یہیں سے مسلم لیگ نے جمعیت سے اتحاد کیا اور اسے عروج ملنے لگا۔ 1939/ میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ 1942/ میں انگریزو! ہندوستان چھوڑو تحریک چلی۔ سب سے پہلے 5/ اگست کو جمعیت علماء کے 4/ اہم ارکان نے اپنے دستخط کیساتھ انگریز ہندوستان چھوڑ دے کا اخباری بیان جاری کرایا اس کے بعد 8/ اگست کو کانگریس نے اپنے اجلاس بمبئی میں " کوئٹ انڈیا" کی تحریک چلائی، جمعیت علماء نے اسکی حمایت کی جس کی پاداش میں حکومت نے کانگریس کے کارکنان اور تحریک آزادی کے رہنماؤں (بطور خاص، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد میاں دیوبندی، مولانا نورالدین بہاری قابل ذکر ہیں، مولانا حسین احمد مدنی کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا) کو گرفتار کرنا شروع کر دیا جس سے عوامی غیض وغضب اور پھوٹ پڑا، ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی گئیں، بجلی کا نظام معطل ہو گیا، سرکاری دفاتر، تھانوں اور کچہریوں کو آگ لگا دی گئی حکومت نے بھی مزید سختی سے کام لیا اور بیدریغ باغیوں کی بھیڑ پر گولیاں چلانے لگی لیکن آزادی کے متوالے سر سے کفن باندھ کر نکلتے تھے بالآخر انگریزوں نے محسوس کر لیا کہ اب ہندوستان کو غلام بنا کر رکھ پانا بہت مشکل ہے اور 15/ اگست 1947/ کو آدھی رات میں ملک کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

المختصر! وطن عزیز کو آزاد کرانے میں زبردست قربانیاں پیش کی گئیں اور ظلم وبربریت کی ایک طویل داستان لکھی گئی جسکا ہر صفحہ ہندوستانیوں خصوصا مسلمانوں کے خون سے لت پت ہے، جذبہ آزادی سے سرشار اور سر پر کفن باندھ کر وطن عزیز اور اپنی تہذیب کی بقاء کیلئے بے خطر آتش افرنگی میں کودنے والوں میں مسلمان صف اول میں تھے، جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانی الگ کر دیں تو ہندوستان کبھی آزاد نہ ہوگا

آزادی کے بعد ملک کے حالات اور مسلمانوں کی حکمت عملی

مجاہدین ملت کی بے پناہ قربانیوں کے بعد آزادی تو مل گئی لیکن

شاطر انگریز ہندو مسلم لڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ملک کی آزادی کیساتھ وطن کی تقسیم کا ناخوشگوار سانحہ بھی پیش آیا۔ویسے تو مسلم لیگ 1940/ سے ہی پاکستان کے نام سے الگ ملک کا مطالبہ کررہی تھی اور 1945/ کے الیکشن میں اس نے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت باور کرانے میں جی توڑ کوشش کیا اور ہندو مسلم منافرت کی ہوابنائی اور یہ نشہ اتنا چڑھا کہ اسکے حامی پاکستان کے مخالفین کے موقف کو سننے تک تیار نہیں تھے،خصوصا مولانا مدنی کیساتھ بدترین گستاخیاں کی گئیں ۔شروع میں کانگریس بھی تقسیم کیلئے تیار نہیں تھی مگر یہ ہونا تھا اور دونظریہ قائم ہوگیا،مسلم لیگ چاہتی تھی کہ انھیں بلاشرکت غیر اقتدار مل جائے۔دوسری طرف متعصب ہندو لیڈر راج گوپال آچاریہ سردار پٹیل،اور پنڈٹ گووند ولبھ پنت جیسے لوگ تھے جو جلد از جلد ایک وسیع ہندو مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے،انگریز پہلے سے ہی موقع کی تلاش میں تھے،یہاں تک کہ گورنر جنرل لارڈ مائنٹ بیٹن نے 3/ جون 1947/ کو تقسیم ہند کی منظوری دیدی،واضح رہے کہ ہم شروع سے تقسیم کے مخالف تھے اس تقسیم کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں تم نے دستخط کیا،تم راضی ہوئے۔اگست میں ہندوستان کو آزادی دیدی،لوگ تقسیم وطن کے درد کو تھوڑی دیر کیلئے بھول گئے اور جشن آزادی میں مشغول ہوگئے،وطن کی مکمل آزادی کی خوشیاں اور شہنائیاں ابھی تھمی بھی نہیں تھیں کہ پنجاب اور بنگال سے تبادلہ آبادی کی بنا پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے،مغربی پنجاب میں مسلمان اپنے پڑوسی ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام کررہے تھے اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہورہا تھا،ٹرینیں ہندو مسلم کی لاشوں سے بھری ہوتی تھیں،سیکڑوں گھرانے راستے میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔پنڈٹ سندلال کے بیان کے مطابق اس ہنگامے میں فریقین کے کم از کم 5/ لاکھ افراد قتل کئے گئے،اربوں کا مالی نقصان ہوا،مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی گئی،افراتفری کا ماحول تھا،مسلمانوں کے قدم اکھڑ چکے تھے،پاکستان کے نام پر تحریک چلانے والے انھیں بے سہارا چھوڑ کر جاچکے تھے۔یہی وہ اندیشے اور برے دن تھے جس کیلئے قائدین خصوصا جمعیت کے اکابرین تیار نہیں تھے نیز یہ کہ کروڑوں مسلمان ہندو اکثریت کے علاقوں میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے،پاکستان ہجرت کرکے جانیوالے سالوں وطنی اور نسلی طعنوں سے نکل نہ پائیں گے اور اسلام کے نام پر الگ ملک کا مطالبہ وہ لوگ کررہے تھے جن کی عملی زندگی میں دور دور تک اسلام کی کوئی نشانی نہیں تھی۔پاکستان کیلئے دیگر اکابرین کے خیالات انتہائی پاکیزہ تھے ان کے خیال میں ہندوستان سے بغاوت یا ہندوستان کو کمزور کرنا بالکل نہیں تھا ان کے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ اس طرح اسلام کے احکامات وحدود کی پاسداری ہوگی۔محدث عظیم مولانا زکریا صاحب نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ مولانا رائے پوری اور مولانا مدنی ان کے مکان پر آئے تھے مشورہ ہوا اور پاکستان ہجرت کرنیوالوں کی تعداد سہارنپور کیمپوں میں بڑھ رہی تھی،حضرت مدنی نے زور دے کر کہا کہ یہاں کے مسلمانوں کو بے سروسامانی کے عالم میں اور خوف ودہشت کے ماحول میں،میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا اور مذکورہ دونوں اکابر نے ہندوستان رہنے کا فیصلہ کیا۔الغرض آزادئ ھند کے بعد حالات انتہائی خراب ہوگئے تھے،آزادی سے قبل علماء خاص کر جمعیت علماء سیاست میں مکمل دخیل تھی ،مگر آزادی کے بعد سیاست سے کنارہ کشی میں عافیت سمجھی اور ساری توانائی مسلمانوں کو بسانے میں صرف کرنے کی منصوبہ بندی کی۔

ملت اسلامیہ ہند مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا احمد سعید رحمھم اللہ کے احسانات کا کبھی حق ادا نہیں کرسکتی جنھوں نے اپنی تقریروں تحریروں اور بھاگ دوڑ کے ذریعہ مسلمانوں کی ڈھارس بڑھائی،صبر واستقلال کا درس دیا اپنی جان کی بازی لگا کر مسلمانوں کے اکھڑے قدم جمایا۔سوچو تو سہی،اگر سب

لوگ پاکستان چلے جاتے تو مساجد وخانقاہیں،اسلامی شعائر مقابر،اوقاف اورلاکھوں کروڑوں کی جائداد کا کیاہوتا؟اس کے علاوہ بھی مصلحتیں تھیں جیسا کہ گزرااسی لئے دسمبر 1947 لکھنؤ کی کانفرنس میں پارلیمانی سیاست سے دست برداری کااعلان ہوا،البتہ انفرادی طور سے حصہ لینے کاراستہ کھلا رہا۔

آزادی کے بعد سب سے بڑامسئلہ تھا ملک کادستورکیساہو؟اقلیت واکثریت کے درمیان حقوق کس طرح طے کئے جائیں آزادی کے بعدملک میں سیکولرجمہوری نظام نافذ کرانے میں جمعیت علماء ہندکارول نظرانداز نہیں کیاجاسکتا،جمعیت کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے بحیثیت رکن دستورساز اسمبلی اقلیتوں کومراعات دلانے میں نمایاں حصہ لیا۔چنانچہ آئین ہند کے ابتدائی حصے میں صاف صاف یہ لکھا گیاہے کہ ہم ہندوستانی عوام تجویز کرتے ہیں کہ انڈیاایک آزاد،سماجوادی، جمہوری ہندوستان کی حیثیت سے وجودمیں لایاجائے جس میں تمام شہریوں کیلئے سماجی، معاشی، سیاسی، انصاف، آزاد خیال، اظہاررائے،آزادئ عقیدہ ومذہب وعبادات، انفرادی تشخص اوراحترام کویقینی بنایاجائے گااورملک کی سالمیت ویکجہتی کوقائم ودائم رکھاجائیگا۔

1971 / میں اندراگاندھی نے دستور کے اسی ابتدائیہ میں لفظ "سیکولر" کااضافہ کیا۔

ملک کی موجودہ صورتحال،حالات اوراندیشے

ایک طویل جدوجہداوربے شمارسردھڑکی بازی لگاکردیش آزادکرایاگیاتاکہ ملک میں خوشحالی آئے،مذہبی آزادی پھرسے میسرہو۔چنانچہ ہندومسلم اتحاد نے اسے ثابت کردکھایالیکن کیاواقعی آج ہم آزاد ہیں؟

آزادی کی حقیقی ومعنوی تعبیرمل چکی؟ کیاشہیدان وطن اسی موجودہ ہندوستان کوچاہتے تھے۔خداجانے میرے خوبصورت وطن کوکس کی نظرلگ گئی ہے کہ پورے ملک میں بدامنی اوربےچینی بڑھتی جارہی ہے،کچھ لوگوں کو یہاں کامیل جول ہندومسلم اتحادبالکل پسندنہیں ہے حالانکہ یہاں مختلف افکاروخیالات اورتہذیب وتمدن کے لوگ بستے ہیں اوریہی تنوع اوررنگارنگی یہاں کی پہچان ہے۔چندفرقہ فرست عناصرہیں جنہیں ملک کی یکتائی اوراسکاسیکولرنظام بالکل پسندنہیں وہ ساری اقلیتوں کو اپنے اندرجذب کرنے یابالکلیہ انکاصفایاکرنے یاملک کے جمہوری ڈھانچے کوتبدیل کرنے کیلئے بیتاب ہیں۔بڑے تعجب کی بات ہے جن کاجنگ آزادی میں کوئی رول نہیں،وطن کی تعمیر میں کوئی کردارنہیں بلکہ ان کے سروں پر بابائے قوم گاندھی جی کاخون ہو،جسکی پیشانی پر مذہبی تقدس کوپامال کرنے کاکلنک ہواورجس کے سروں پر ہزاروں فسادات، لاکھوں بےقصورانسانوں کےقتل اوراربوں کھربوں کی تباہی کاقومی گناہ ہو وہ ملک کواپناغلام بناناچاہتاہے لوگ کیسے اپنی گردنیں ان کے حوالے کرسکتے ہیں؟ ملک کی بےمثال جمہوریت اورخوبصورت نظام کا کیاحشرہورہاہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے،حکومت!دنگائیوں،بلوائیوں کےآگے بے بس ہے،روزافزوں مہنگائی،بیروزگاری کی بڑھتی شرحیں، آسمان چھوتی اشیاء کی قیمتیں،غیرمحفوظ ماں اوربہنیں،پاکستان کی گھس پیٹیاں اورہمارے جوانوں کوہراساں کرنا،پڑھے لکھے جوانوں کی بیروزگاریاں ،بنیادی تعلیم،علاج اورروٹی مکان جیسے سیکڑوں مدعےاوراہم ایشوز ہیں جن پرحکومت کوترجیحی بنیاد پر فاسٹ کام کرنیکی ضرورت تھی لیکن اس طرف توجہ نہ کرکے لوگوں کے پرسنل مسائل پرتوانائی صرف کررہی ہے ،لوجہاد،موب لنچنگ،گئورکھشک جیسے گھنونے میٹرپرخاموش تماشائی سرکارگویاانھیں مواقع فراہم کررہی ہے۔ملک میں ایک دوسرے سےنفرت کی آگ تیزی سے پھیل رہی ہے،ہندومسلم اتحادکی صدیوں پرانی اورمضبوط دیوار میں سیندھ نہیں دراڑیں پڑرہی ہیں،مذہبی منافرت اورپولرائزیشن کی سیاست عام ہوتی جارہی ہے، کھلےعام مارنے کاٹنے کی بات ہورہی ہے۔کیااس

طرح الجھ کر ہم ایک مثبت وطن کی تعمیر کی توقع رکھ سکتے ہیں ؟ کیا ملک کی ترقی ممکن ہے ؟ کیا ہم خود اپنے ہاتھوں ملک کو کمزور نہیں کر رہے ہیں ،شہیدان وطن کو ہم کیا جواب دین گے؟منتخب حکومتین بلاتفریق سب کیلئے ہوتی ہیں انھیں اصولی اورآئینی حکومت چلانے میں کسی کا آلہ کار نہیں بننا چاہئے ۔ترقی ،اتحاد،محبت اور امن کی باتیں کر کے ملک کو بحران سے بچانے کی فکر کرنی چاہئے ،ہم ایک خوبصورت، بلند، پھولوں سے لدے، خوشبوؤں سے مہکتے بھارت کی تعمیر چاہتے ہیں ،ایسی سوچ پر ہم آپ کے ساتھ ہیں کیا آپ بھی متفق ہیں

سارے جہاں سے اچھاہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

بقیہ ،ص: ۴۰ کا

پاک کرکٹرس کی طرح ہی ہندوستان اور دوسرے ممالک کے کرکٹ کھلاڑی عمران خان سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے سابق کرکٹر وقار یونس نے کہا کہ عمران خان کرکٹ کی طرح ملک کی قیادت بھی کامیابی کے ساتھ سنبھالتے ہوئے اسے مشکلات سے نکالیں گے۔انھوں نے کہا کہ عمران خان کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے کرکٹ میں کبھی بھی ہار نہیں مانی اور نہ ہی وہ سیاست میں حوصلہ ہارے ہیں۔ جب وہ کرکٹ میں تھے تو انہوں نے اپنی محنت اور حوصلہ مندی سے خود کو ایک کامیاب آل راؤنڈر اور کپتان ثابت کیا اور اب وہ سیاست میں خود کو ایک ایماندار لیڈر کے طور پر ثابت کر چکے ہیں۔ظاہر سی بات ہے۔ پاکستان ان دنوں متعدد مسائل سے دوچار ہے۔خاص کر بدعنوانی شباب پر ہے۔ملک قرضوں تلے دبے ہوا ہے۔صحت، تعلیم، پانی، بجلی اور کئی دوسرے مسائل موجود ہیں۔ اس صورتحال میں پاکستان کو ایک سچے اور ایماندار لیڈر کی ضرورت ہے۔۔یعنی عمران خان کے سامنے حدف بڑا مشکل اور کٹھن ہے۔ جہاں انہیں ایک طرف اپنے پیر جمانے ہیں۔ تو وہیں متعدد مسائل سے نمٹنا بھی ہے۔کیا عمران پاکستان کو کرپشن پاک۔ ڈر وخوف کے ماحول سے باہر نکال پائیں گے۔ یہ سوٹکے کا سوال ہے۔

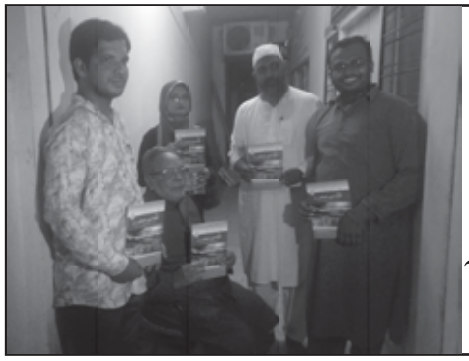

ماہنامہ صدائے شبلی علامہ اعجاز فرخ کے ہاتھوں میں ساتھ میں ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر غوثیہ بانو، محسن خان

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد پروفیسر عزیز بانو ، پروفیسر ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر رفیق احمد، قاری وقار احمد، ڈاکٹر رضوان احمد اور ڈاکٹر قیصر کے ہاتھوں میں

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد صوفی محمد عقیل انصاری صوفی خیرالدین، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی اور ابو ہریرہ یوسفی کے ہاتھوں میں

عبدالوحید ندوی، حیدرآباد

عیدالاضحیٰ ایک عظیم یادگار

ہر قوم کے لئے کچھ خاص تہوار ہوتے ہیں، اسلام میں بھی ایسے دو دن متعین کئے گئے ہیں ایک عیدالفطر اور دوسرے عیدالاضحیٰ، بس یہی مسلمانوں کے اصل اور مذہبی تہوار ہیں، ان کے علاوہ مسلمان جو تہوار مناتے ہیں ان کی کوئی مذہبی حیثیت اور بنیاد نہیں ہے۔

عیدالاضحیٰ کا دن بڑی خوشی اور مسرت کا دن ہے، ہماری اس خوشی کا تعلق حج اور قربانی سے ہے، لاکھوں مسلمانوں کو اس سال حج کی سعادت نصیب ہوئی، اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی محبت اور عقیدت کا ثبوت پیش کیا، اس کی خوشی کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں، اور اپنے ہر عمل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے آقا اور مالک کے اشاروں پر کس طرح اپنے آرام، اپنے مال اور اپنی خواہشات کو قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ہم میں سے کون ایسا شخص ہے جو پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ جانتا ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلیل اللہ کے لقب سے سرفراز فرمایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی اس بات کا ثبوت دیا کہ انہیں اللہ کی مرضی اور اس کی خوشنودی سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہ تھی، اسی خوشنودی کو حاصل کرنے کیلئے آپ نے اپنے محبوب وطن کو چھوڑ دیا، اِنِّی ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ،یعنی میں اس ماحول میں سانس نہیں لے سکتا، جہاں مجھے اپنے رب کی مرضی پوری کرنے کا حق حاصل نہ ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصَّالِحِیْنَ ، اے میرے رب! تو مجھے صالح اولاد عطا فرما، یہ ایک بہترین مقصد کے لئے بہترین دعا تھی، ارشاد ہوا، فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِیْمٍ ،تو ہم نے اس کو ایک حلیم لڑکے کی ولادت کی خوش خبری دی، چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یَا بُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ،اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک اور سخت امتحان سے گذارے گئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے، بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ، میں تم کو اللہ کی راہ میں قربان کررہا ہوں تو بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ اب یہ امتحان دونوں کا ہوگیا، باپ کے سامنے یہ سوال کہ وہ اپنی بڑھاپے کی دعاؤں کے نتیجے کو اللہ کا اشارہ پاتے ہیں اپنے ہاتھوں اس کے لئے قربان کردے، اور بیٹے کا یہ امتحان کہ وہ اپنی جان اللہ کی رضا کی خاطر قربان کرنے کے لئے بخوشی تیار ہوجائے، قَالَ یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْشَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ صالح بیٹے نے جواب دیا، والد محترم آپ کو جو حکم ملا ہے اس کو کر گذریئے انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم لوگوں میں پائیں گے۔

نیک بندے کا اصل مقام یہی ہے کہ مالک کی مرضی کے سامنے کسی چیز کی اہمیت نہیں، فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ، جب دونوں اللہ کے حکم کے سامنے جھک گئے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا تو یہ ثابت ہوگیا، کہ دونوں اپنی اطاعت اور فرمانبرداری میں پورے اترے۔ اسی کا امتحان تھا ،وَنَادَیْنَاهُ اَنْ یّٰاِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِیْنُ ، چنانچہ ہم نے اس کو پکارا، اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ

کر دکھایا، بیشک ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی، دونوں امتحان میں کامیاب ہو گئے ،دونوں نے وہ کر دکھایا جو مطلوب تھا، وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ، اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر ان کو چھڑا لیا، اللہ تعالیٰ نے اسی قربانی کی یادگار میں قربانی کی ایک عالمگیر اور عظیم الشان سنت قائم فرمادی۔

یہ ابرہیم علیہ السلام کی سرگذشت ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مبارک کتاب میں ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے محفوظ فرمادیا ہے۔

قربانی اگر خلوص نیت کے ساتھ کی جائے تو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ مِن عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِحْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّهٗ لَيَاْتِىْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِا الْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا ،قربانی کے دن انسان کا کوئی عمل اس سے زیادہ افضل نہیں، کہ وہ اللہ کی راہ میں جانوروں کی قربانی پیش کر کے ان کا خون بہائے ،اور یہ کہ قربانی کے جانور قیامت کے دن اپنی سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت صحیح سالم حالت میں آئیں گے، اور یہ کہ قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ومحبوب ہو جاتا ہے، پس اے خدا کے بندو، دل کی پوری خوشی سے قربانیاں کیا کرو۔(ترمذی ، ان ماجہ)

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِىُّ قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ قَالُوْا مَا لَنَا مِنْهَا قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَا لصُّوْفُ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِّنَ الصُّوْفِ حَسَنَةٌ (مسند احمد)

اے اللہ کے رسول ﷺ یہ قربانی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ تمہارے باپ دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔صحابہ کرام نے عرض کیا ہمارے لئے اس میں کیا اجر وثواب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا قربانی کے ہر بال کے عوض نیکی ہے ،صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ''اون'' کا کیا معاملہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا اون کے ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ وَّجَدَ سَعَةً لِاَنْ يُّضَحِّىْ فَلَمْ يُضَحِّىْ فَلَا يَحْضُرْ مُصَلَّانَا (ترغیب عن الحاکم)

جو شخص قربانی کی طاقت رکھتے ہوئے قربانی نہ کرے، وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔

قربانی کی دعا:

اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذَالِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ، اَللّٰهُمَّ لَكَ وَمِنْكَ ، بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَر.

میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس کی طرف کیا، جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، میں شرک نہیں کرتا، بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا، سب اللہ کے لئے ہے ، جو سارے جہاں کا رب ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم ہوا ہے اور سب سے پہلے سر تسلیم خم کرنے والا میں ہوں، اے اللہ، یہ تیرے لئے ہے اور تیرا ہی عطا کردہ ہے، اللہ کے نام سے اللہ بہت بڑا ہے۔

ذبح کے بعد کی دعا:

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّى كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ خَلِيْلِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَحَبِيْبِكَ مُحَمَّدٍ عَلَيْهَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

اے اللہ ، اسے میری طرف سے قبول فرما ، جس طرح تو نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام اور اپنے حبیب

ڈاکٹر ضیاء احمد
نیوز18 نیٹ ورک۔ حیدرآباد

جنگ آزادی کا مجاہد

حضرت محمد ﷺ کی طرف سے قبول فرمایا ہے۔

جناب محمد منظور صاحب، مقام پوسٹ۔ رتوارہ تھانہ کلیان پور ضلع سمستی پور ریاست بہار کے باشندے ہیں۔ جن کی عمر فی الحال 100 سال سے بھی زیادہ ہے۔ جنہوں نے جنگ آزادی سے پہلے اور بعد کے ہندوستان کو نہایت ہی قریب سے دیکھا۔ منظور صاحب آج بھی جنگ آزادی کے اس خوفناک منظر کو جب بیان کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں۔ جنگ آزادی سے پہلے بنانی کمپنی کلکتہ میں 1942 میں صرف 72 روپے ماہانہ پر ملازمت کرتے تھے۔ ان کا کام بلاسٹ فارنس میں فولاد کو ڈھالنا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب پورے ملک پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا زبردست بول بالا تھا۔ اور کلکتہ انگریزی حکومت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس دور میں انگریزی حکومت میں ملازمت باعث فخر سمجھی جاتی تھی۔ مگر آزادی کے متوالے ملک کو انگریزوں کے چنگل سے ہندوستان کو آزاد کرانے کو بے تاب تھے۔ اس وقت ہندوستان کی تحریک آزادی میں شدت آرہی تھی۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر رہنماؤں نے ہندوستان سے انگریزوں کی جابرانہ حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کیلئے سرگرم تھے۔ حالانکہ اس دوران 1942 میں بھارت چھوڑو آندولن شروع ہوئی۔ اس تحریک میں شامل ہونے کیلئے منظور صاحب نے دس سالہ ملازمت کو ترک کرکے وطن عزیز کی خدمت کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ حالانکہ اس وقت بنانی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹران کی بڑی خوشامد کی اور اعلی عہدے کا لالچ بھی دیا مگر منظور صاحب نے ان کی پیشکش کو ٹھکرا کر ملک کی خدمت کرنا ہی اپنا اولین فرض سمجھا۔ حالانکہ ان کے اس فیصلے سے کمپنی کے اوپر بقایا رقم سے نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن ملک کی خاطر انہوں نے اس کی ذرّہ برابر پرواہ نہیں کی۔

ہر سچے ہندوستان کی طرح منظور صاحب کا دل ملک کی آزادی کیلئے بے چین و بے قرار تھا۔ اسی وجہ سے اپنی بیش بہا ملازمت کو ترک کرکے بھارت چھوڑو آندولن کا حصہ بنے۔ کلکتہ چھوڑنے کا فوراً عزم کرلیا۔ یہ وہ دور تھا جب کلکتہ میں حالات خراب ہوتے جارہے تھے۔ جگہ جگہ انگریزوں کا ظلم و استبداد تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ انگریز اپنی اسی ظالمانہ حرکت سے تحریک کو کمزور کرنا چاہ رہے تھے۔ اسی دوران منظور صاحب نے کلکتہ چھوڑ کر اپنی آبائی ریاست بہار جانے کا من بنالیا۔ بھارت چھوڑو آندولن میں شامل ہوکر منظور صاحب نے تقریباً ہزاروں کیلومیٹر کا لمبا سفر طے کرکے اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ کلکتہ سے سمستی پور کے رتوارہ گاؤں تک انگریزوں سے مقابلہ کرنے کیلئے جا پہنچے۔ اپنے اہل خانہ کے درمیان پہنچ کر منظور صاحب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مگر دوسری جانب ملک کی آزادی کا جزبہ ان کے دل و دماغ میں سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایسے حالات میں اہل خانہ کی محبتوں سے بھی زیادہ مادر وطن کی محبت تھی۔

اس دوران بہار کی دارالحکومت پٹنہ بھی ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ کا سنہرا باب لکھنے کیلئے بیتاب تھا۔ پٹنہ آزادی کی تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا۔ منظور صاحب بغیر اپنا وقت گنوائے پٹنہ آپہنچے۔ اور آزادی کے مشن میں شانہ بشانہ ہوگئے۔ یہاں پر انہیں بابائے قوم وملت مہاتما گاندھی جی کی صحبت میں رہنے کا

بہترین موقعہ ملا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب گاندھی کی شخصیت کو نہایت ہی قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بہت ہی کم وقفے میں ان سے بے پناہ متاثر بھی ہوئے۔ منظور صاحب بتاتے ہیں کہ گاندھی جی صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ ایک گاندھی ایک مشن اور ایک تحریک کا نام ہے۔ جس نے ملک کو بین الاقوامی سطح پر منفرد پہچان دلائی۔ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ سچائی کے پیکر تھے انصاف کے مجسمہ تھے۔ اور عدم تشدد کے حامی تھے۔ آپسی بھائی چارگی اتحاد اور قومی یکجہتی کی نہایت عمدہ مثال تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جناب منظور صاحب آج بھی ان کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔ ہر بات پر گاندھی جی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ گاندھی جی جیسا جہاں دیدہ شخص ملنا مشکل ہے۔

حالانکہ منظور صاحب نے پٹنہ میں جنگ آزادی کی تحریک کی کئی ہنگامی میٹنگ میں شرکت کی۔ ان کے جذبے کو دیکھتے ہوئے کئی جلسے جلوسوں میں باقاعدہ ہر طرح سے رکن کی حیثیت یا پھر والنٹیئر کی مناسبت سے اپنے کار خیر کو بحسن خوبی انجام دیتے تھے۔ ساتھ ہی تحریک آزادی سے متعلق اپنا فرض سمجھ کر نبھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ منظور صاحب کی شخصیت ہر خاص عام کو متاثر کرتی تھی۔ حالانکہ پٹنہ دورے سے جنگ آزادی کا چراغ کئی ضلعوں کے ساتھ دربھنگہ سمستی پور کے کئی گاؤں میں روشن ہوا۔ اس وقت ان لوگوں کی بدولت علاقے میں تحریک آزادی کو بے انتہا تقویت ملی۔ کل ملا کر پورے ملک کی طرح بہار کے کئی اضلاع میں جنگ آزادی کی تحریک پورے شباب پر تھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف اب گاؤں گاؤں سے آواز بلند ہو رہی تھی۔ انگریز کے جلد از جلد ہندستان چھوڑو کے نعروں سے ہر عام و خاص میں آزادی کی نئی صبح کا بہت ہی بے صبری سے انتظار تھا۔ اب گاؤں کے گردونواح میں منظور صاحب کی محنت رنگ لا چکی تھی۔ جس سے ان کا حوصلہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ اور وطن عزیز کی آزادی کا خواب تعبیر ہونے کے قریب دیکھنے لگا۔ آخر کار منظور صاحب جیسے آزادی کے ان گنت مجاہدین کی محنتیں رنگ لائی۔ اور ملک انگریزی حکومت کے خونی پنجے سے آزاد ہوا۔ اور دہلی کے لال قلعہ کی فصیل پر ملک کا ترنگا اپنی پوری آن بان شان سے لہرا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ملک کے کروڑوں لوگوں نے آزاد فضا میں پُرسکون کی سانس لی۔

جنگ آزادی کے بعد ملک کو سب سے بڑے چیلنج کا سامنا یہ تھا کہ ملک کی تقسیم کی وجہ سے ہندو مسلم کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ آزادی کے متوالوں نے ایک ساتھ مل کر دیش کو انگریزوں کی زبردست گرفت سے مکمل طور پر آزاد کروایا اور پھر انگریزوں نے ایسی سازش رچی، جس کو ہندستانیوں نے سمجھا نہیں اور پھر دیکھتے دیکھتے ہندو مسلم کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہوگئی، جس کے نتیجے میں ہندستان دو ٹکڑوں میں بٹ کر پاکستان کی شکل میں وجود میں آیا، اسی دوران فرقہ وارانہ فسادات نے ہندو مسلم کے اتحاد کو بے انتہا کمزور کر دیا۔ اس زہریلی فضا میں مسلمانوں کا ایک طبقہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا، تو وہیں سیاسی رہنماؤں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو پاکستان میں پناہ اور ان کو تحفظ کا سنہرا خواب دکھلانے پر مجبور کیا، ایک طرف محمد علی جناح نے ہندستانی مسلمانوں کے اندر الگ ملک کے مطالبے کو لے کر جذبات پیدا کیا اور انہیں پاکستان کی شہریت قبول کرنے کے عوض سبز باغ دیکھائے گئے۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے دلی کی جامع مسجد سے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''کیا تم اپنے وطن عزیز کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟ کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ تمہاری حیثیت وہاں بن بلائے مہمان کی طرح ہوگی؟ اور تمہارا درجہ ایک مہاجر کی طرح ہوگا۔ کیا تم نے یہ غور کیا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد ہندستان کی مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں اور قبرستانوں کا کیا حال ہوگا؟''۔

مولانا آزاد کی تقریر سے مسلمانوں کا بڑا طبقہ بے حد

متاثر ہوا اور پاکستان جانے کا ارادہ ترک کر کے اپنے ملک کی چہار دیواری کی پرسکون فضا کو اپنا روشن مستقبل سمجھا۔ اسی دوران محمد منظور صاحب کی ملاقات محمد علی جناح سے ہوئی اور انہوں نے ان کی ساری باتوں کو ٹھکرا کر اپنے وطن عزیز کی خاک سے محبت اور خدمت کو اپنا اہم فریضہ سمجھا، ہزار کوششوں کے باوجود کوئی بھی شخص منظور صاحب کے ضمیر کا سودا نہیں کر سکا۔ جبکہ انہوں نے بہار کے مسلمانوں کے بڑے طبقے کو وطن عزیز کے ساتھ حب الوطنی کا درس دے کر اپنے ملک کی حفاظت کا عمدہ نمونہ پیش کیا تھا۔

اب ملک کو مکمل آزادی مل چکی تھی اور تقسیم ہند کا مسئلہ بھی دھیرے دھیرے لوگوں کے ذہن سے اوجھل ہو رہا تھا۔ ہندستان لگاتار ترقی کی منزلیں طے کرتے جا رہا تھا۔ منظور صاحب ذکر کرتے ہیں کہ اس زمانے کی بھائی چارگی کی مثال آج کے دور میں نہیں ملتی ہے۔ منتری سے لے کر سنتری تک، راجہ سے لے کر رنک تک، معمولی مزدوروں سے لے کر بڑے بڑے کاروباریوں تک کے درمیان اچھے رشتے اور تعلقات ہوا کرتے تھے اور سبھی کا مشن ایک ہی تھا کہ آزاد ہندستان جلد دنیا کے نقشے پر اپنی پہچان بنائے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار پٹیل اور دیگر رہنماؤں کی رہنمائی کے بعد ملک کی باگ دوڑ تاریخ کی سب سے طاقت ور خاتون اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں آئی۔ جب ملک کافی تیزی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگا تو منظور صاحب بتاتے ہیں کہ سونے کی چڑیا کو نہ جانے کس کی منحوس نظر لگ گئی اور ملک کو ایمرجنسی جیسے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ایمرجنسی کا یہ خطرناک دور ملک کی آزادی کے بعد سب سے زیادہ نازک دور تھا۔ بقول منظور صاحب ایمرجنسی کے حالات میں ملک کے ہر عام وخواص میں خوف ودہشت کا ماحول تھا۔ یہ جمہوری ملک کے آئین پر ایک سیاہ دھبہ تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اپنے والد پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح اندرا گاندھی میں خوبیاں تو موجود تھیں، مگر ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے اپنی شبیہ خراب کر دی۔ ایمرجنسی کا خمیازہ اندرا گاندھی کو زبردست شکست کی شکل میں دیکھنا پڑا اور پھر ملک کی باگ دوڑ جنتا دل کے ہاتھوں میں آ گئی۔

جناب منظور صاحب عمر کے سو سال سے بھی زیادہ ہونے کے باوجود جنگ آزادی اور اس کے بعد حکومت کے کئی دور کو دیکھ چکے ہیں لیکن آج بھی وہ وقت یاد کر کے ان کا دل تڑپ جاتا ہے کہ وہ وقت کچھ اور تھا اور یہ وقت کچھ اور ہے۔ موجودہ دور میں اب مزید گراوٹ آ گئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی قدر وعزت کرنا بھول گئے ہیں، بڑوں، چھوٹوں میں بداخلاقی معاشرے کو پراگندہ کر رہا ہے۔ ایماندار، جانباز اور جہاں دیدہ رہنما بابائے قوم مہاتما گاندھی جیسی عظیم شخصیت آنے والی نئی نسل کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مسلمانوں کے اہم ترین رہنمائی سے ہم لوگوں کو سبق لینے کی ضرورت ہے، لیکن نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ ہندستان کی عوام اپنے عظیم رہنماؤں کی تاریخ کو بھولتے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے آج ملک میں ہر طرف بے چینی اور نااتفاقی کا ماحول ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہم سب کو ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ اگر ہم سب کو خوشحالی کی منزلیں امن وسکون کے ساتھ طے کرنا ہے تو اپنے رہنماؤں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا تبھی ملک امن وسکون کی پرسکون فضا میں سانس لے سکے گا۔

بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ شری کرشن سنگھ اور کرپوری ٹھاکر کے اس دور کو منظور صاحب نے کافی نزدیک سے دیکھا ہے اور ساتھ ہی بہار کی ترقی، خوشحالی، امن اور بھائی چارگی کے علاوہ کئی اہم موضوعات پر تفصیلی گفتگو بھی کی ہے۔ منظور صاحب ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ ہندستان کے نقشے پر بہار کی بھی خوشحالی ترقی کا پرچم لہراتا رہے۔ انہیں وجوہات کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور اپنی زیادہ

ترمصروفیات سے وقت نکال کر وہ وزیراعلی سے گاہے بہ گاہے ملاقات کر کے اپنے قرب وجوار کے مسائل کا حل بخوبی کروادیا کرتے تھے، حالانکہ بہار کے سب سے ایماندار اور زمین سے جڑے شخص کرپوری ٹھاکر جو سمستی پور کے رہی رہنے والے تھے، جب بھی اپنے گھر آتے تو جناب منظور صاحب سے ان کے رہائش گاہ پر ملنے خود آجاتے اور جب کبھی موقعہ نہیں رہتا تو کسی کے ذریعہ زبانی پیغام بھیجواتے کہ فلاں جگہ میرا پروگرام ہے، اگر آپ کے پاس فرصت ہو تو ملاقات کرلیں تو منظور صاحب وقت نکال کر جاتے اور پھر ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہار کی تیز رفتار ترقی جیسی باتوں پر زیادہ زور دیتے۔ بقول منظور صاحب کرپوری ٹھاکر جیسا ایماندار اور نیک طبیعت کا مالک وزیراعلیٰ بہار کی سرزمین سے آج نہ کوئی نکلا ہے اور نا ہی نکلے گا۔

بہرکیف منظور صاحب کی آنکھوں نے ہندستان کے ابھی تک بنتے بگڑتے تمام حالات دیکھے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے نریندر مودی تک کے ہندستان کے تمام وہ مناظر دیکھے ہیں۔محسوس کیے ہیں اور سمجھے ہیں، وہ ملک کے بدلتے حالات سے بیحد مایوس نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کے سیاسی لیڈران میں نہ فکر ہے، نہ شعور اور نہ ہی عوام کی خدمت کا جذبہ ہے۔صرف پیسہ پیسہ کرتے کرتے نظر آتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ بدعنوانیاں لیڈران کے خون میں پیوست ہوچکی ہیں۔منظور صاحب واضح طور پر کہتے ہیں کہ ہندستان کی آزادی کا جو مقصد تھا وہ آج کے ہمارے رہنماؤں نے فوت کردیا اور آج اس ملک کا اللہ ہی نگہبان ہے۔

وہیں منظور صاحب کو نئی نسل سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ آج کی نئی نسل کو اپنی تاریخ سے سبق حاصل کر کے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے، تبھی ہمارا ملک ترقی کرے گا۔ ہندو مسلم ہندستان کی دو آنکھیں ہیں۔ یہاں گنگا جمنی تہذیب کی عمدہ مثال ملک کے دوسرے گوشے میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احترام اور قدر کریں اور آپسی بھائی چارگی کا عمدہ نمونہ پیش کریں تو ملک دنیا کے نقشے پر امن وسکون کا پیکر کہلائے

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

غزل

مجھے اب آسماں کے پار جانا ہے
نکل کر اس جہاں سے یار جانا ہے

میں اس کے لفظ کے ہر حرف میں ہوں گا
دکھا کر ان کو ایسا پیار جانا ہے

یہ ہے دستور الفت کا زمانے میں
ہمیشہ جیت کر بھی ہار جانا ہے

صداقت کیا ہو میری بے زبانی کی
سبھی نے مجھ کو بدکردار جانا ہے

برسنا ان کی فطرت ہے مقدر ہے
جو میں نے ان کو اب دلدار جانا ہے

یوم آزادی

اقبال سہیل

گا۔

بسنت آئی ہے، رت بدلی ہے، غنچے مسکراتے ہیں
ہوا جنگل میں منگل، کھیت ہرسو لہلہاتے ہیں
پرندے آشیانوں میں خوشی سے چہچہاتے ہیں
قفس کے بسنے والے کیا کریں پر پھڑ پھڑاتے ہیں
وطن والے وطن میں یومِ آزادی مناتے ہیں

بسنتی پھول وہ سرسوں کے وہ کھیتوں کی ہریاول
زری کے کام سے گویا سجائی ہے ہری محمل
ادھر وہ سرخ پھولوں سے دمکتا ڈھاک کا جنگل
کلی کچنال کی، بور آم کے، پھولے ہوئے کٹہل
وطن والوں کو سب پیغامِ آزادی سناتے ہیں

تغیر رازِ فطرت ہے، جہاں ہردم بدلتا ہے
زمیں سے تاک فلک ہر ذرہ عالم بدلتا ہے
زمانہ روزوشب کی کروٹیں پیہم بدلتا ہے
بدل جانا ہے ہم کو بھی کہ اب موسم بدلتا ہے
سلام اے گوشۂ زنداں کہ ہم صحرا کو جاتے ہیں

وہ آزادی کا سورج پھر نئے انداز سے چمکا
ہو پرواز پر آمادہ، پھر ہر قطرہ شبنم کا
وطن والوں کو یہ پیغام ہے تبدیلِ موسم کا
کہ دورِ انقلاب آیا نیا ہے رنگ عالم کا
ہم اپنے دیس میں اب پھر نئی محفل سجاتے ہیں

وطن پیارے وطن تیری محبت دل میں بستی ہے
یہی ہے کائنات اپنی یہی کل اپنی ہستی ہے
نہ شوقِ بادہ خواری ہے نہ ذوقِ مئے پرستی ہے
یہ کمزوری نہیں عشقِ وطن کا جوشِ مستی ہے
ہمارے پاؤں جو ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتے ہیں

چھڑائی جا نہیں سکتی محبت ہند کی ہم سے
کہ پائی ہے وراثت میں زمیں یہ ہم نے آدمؑ سے
نکلنا ہے بہرصورت غلامی کی جہنم سے
لگائیں گے ہم اپنی لو اب آزادی کے پرچم سے
اسی جادو سے ہم سوئی ہوئی قسمت جگاتے ہیں

جئے کیا جو اسیرِ پنجۂ صیاد جیتے ہیں
انہی زندگی کا حق ہے جو آزاد جیتے ہیں
کہیں کیا کس طرح ہم آشیاں برباد جیتے ہیں
بہت بے لطف جیتے ہیں بہت ناشاد جیتے ہیں
غرض جیتے نہیں زندگی منہ چڑھاتے ہیں

نئے گل نئے گل، پھر خاک چمن پیدا
نئی سج دھج ہو گلشن کی نیا ہو بانکپن پیدا
الٰہی پھر دنوں میں ہو نیا دورِ وطن پیدا
غلاموں میں بھی ہو آزاد رہنے کی لگن پیدا
انہیں بھی ہو جنوں، جو ہم کو دیوانہ بناتے ہیں

ادھر ہندو کی جے کاریں، ادھر مسلم کی تکبیریں
ملیں جس وقت باہم خود چمک اٹھیں گی تقدیریں
نظر آنے لگیں گی دورِ آزادی کی تصویریں
جنوں اپنا سلامت ہے تو کھل جائیں گی زنجیریں
ابھی دو چار جھٹکوں میں انہیں ٹکڑے بناتے ہیں

ڈاکٹر جمیلہ بی بی
گھورکپور اتر پردیش

اردو تنقید اور قمر رئیس

اردو تنقید شروع سے لے کر اب تک مختلف مراحل سے گذرتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ دوسرے اصناف سے زیادہ مقبول وعام بھی ہے۔ جہاں ایک طرف اس میں الگ الگ تحریکیں اور رجحانات قدم جمائے وہیں ان سے وابستہ ناقدین نے بھی اپنے نظریات وخیالات سے اردو تنقید کے خزانے میں اضافہ کیا۔ ان ناقدین میں قمر رئیس بھی ایک اہم نام ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تنقید میں کس نظریے کے حامی تھے۔ اس سلسلے میں انہیں ترقی پسند ناقدین کی صف میں اہم مقام حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک فعال تحریک رہی ہے۔ اس نے اردو ادب کو وسعت دینے کے ساتھ اس میں حقیقت پسندی کا رنگ بھی بھرا۔ سجاد ظہیر اس تحریک کے علم بردار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے بعد پروفیسر قمر رئیس اس کے روح رواں اور سپہ سالار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس تحریک کی لو کو مدھم ہونے سے بچایا، اس کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو یکجا کیا، پھر سے ایک نیا پلیٹ فارم مہیا کیا جس میں ایک نئی سوچ اور عصری حقائق کو ادب میں جگہ دینے کی اپیل کی گئی۔ قمر رئیس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے جدیدیت کے شکنجے میں پھنسنے کے بجائے خود کے وقار کو ایک نئی بلندی اور نئی حقیقت نگاری سے ہم آہنگ کیا اور اپنے وجود کو مٹنے سے بچایا۔ کچھ لوگ انہیں اشتراکی ترقی پسندی کا مبلغ بھی کہنے لگے۔ اس بارے میں شارب ردولوی یوں رقم طراز ہیں:

''بعض لوگ انہیں ''اشتراکی ترقی پسندی کا اہم ناقد اور مبلغ'' مانتے ہیں۔ یہ بات پورے سچ پر مبنی نہیں۔ مارکسزم کے انسان دوستی کے پہلو پر سب کو یقین تھا۔ قمر رئیس نے بھی اشتراکیت یا اگر کوئی چیز ''اشتراکی ترقی پسندی'' تھی تو اس کی کسی طرح بھی تبلیغ نہیں کی۔ وہ پورے کمیونسٹ بھی کبھی نہیں رہے .....قمر رئیس کی کتابوں یا ان کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے سینکڑوں مضامین میں کسی جگہ نہ تو اشتراکیت کی تبلیغ ہے اور نہ کسی طرح کی ادعائیت۔ یہ بات لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان کے اندر کہیں ایک نازک تخلیقی فنکار بھی چھپا ہوا تھا۔ اگر ادب کے زندگی سے تعلق اس کے بین السطور میں پوشیدہ سماجی۔ تہذیبی یا ثقافتی سیاق یا رشتوں کا ذکر یا مارکس کے حوالے سے ادبی مطالعہ میں کسی عہد کی حقیقتوں کی تلاش نہ اشتراکی تنقید نگاری ہے اور نہ تبلیغ۔''

(قمر رئیس آثار واحوال۔ ترتیب وتہذیب۔ پروفیسر محمد ظفر الدین، ص۔۷۴۔۷۵)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قمر رئیس اپنے آخری دنوں میں نئی حقیقت نگاری کی باتیں کرنے لگے تھے۔ نئی حقیقت نگاری سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عصر حاضر میں پیش آرہے نئے مسائل وپیچیدگیوں کو بھی ادب میں لانے کی کوشش کی جائے۔ وہ انسانی مسائل کو اس کی بدلتی ہوئی زندگی اور حالات کی روشنی میں دیکھنے کے متلاشی نظر آنے لگے تھے۔ وہ عصری مسائل کو زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کی روشنی میں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کی نظر میں کوئی بھی ادبی تخلیق اپنے عہد اور سماج کی عکاس ہوتی ہے۔

جہاں تک ترقی پسند ناقدین میں ان کے مقام کا سوال ہے اگر ترقی پسند ناقدین کی مختصر فہرست بھی بنائی جائے تو اس میں احتشام حسین، آل احمد سرور اور محمد حسن کے ساتھ ان کا

بھی نام سرفہرست ہوگا۔ان کے ترقی پسند رویہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عابد سہیل لکھتے ہیں:

''ان کی ترقی پسندی ایک آب جو نہیں بلکہ سمندر ہے جس میں چھوٹی بڑی ندیاں اپنی شناخت کھو کر ایک بڑی حقیقت کا حصہ بن جاتی ہیں۔افسانوی ادب پر قمر رئیس کی تحریروں میں مجادلہ کے بجائے مفاہمت کی راہیں زیادہ واضح ہیں اور اس طرح وہ اردو میں فکشن کے واحد نقاد ہیں جو ترقی پسندی کے بنیادی تصورات سے انحراف نہ کرنے کے باوجود اردو افسانے کی اصل روایت کو ایک بڑے کل (whole) کی طرح دیکھتے ہیں، مختلف اجزاء کی طرح نہیں۔صحیح ترقی پسند رویہ شاید یہی ہے۔''

(قمر رئیس اور افسانے کی پرکھ: چند اشارے، عابد سہیل، ایوان اردو ۔ستمبر،۲۰۰۹،ص۔۵۶)

ترقی پسند تنقید کو لے کر ان کا سب سے روشن پہلو یہی تھا کہ وہ اپنے طالب علمی سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس سے وابستہ رہے۔اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کیا۔اس کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وقت اور حالات کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی لانے کے خواہاں نظر آئے۔اس تبدیلی کے لیے انہوں نے ترقی پسند تحریک کے پرانے نظریات سے اختلاف بھی کیا۔ اس تحریک کو نئی وسعت و معنویت دینے کے لیے اپنے ہم عصروں کو اکٹھا کیا اور سب کو نئی ترقی پسندی و حقیقت پسندی کی جانب راغب کیا۔

ترقی پسند تنقید کے علاوہ اگر ہم کسی اور نظریہ کی بات کریں تو اس میدان میں قمر رئیس مارکسی اور سماجی نظریہ کے حامی نظر آتے ہیں۔ان کی تحریروں میں جابجا اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔وہ جب بھی کسی فن پارے کا جائزہ لیتے ہیں تو فن کار کے ماحول اور اس کے دور کے سماجی و سیاسی عوامل کا بھی مطالعہ ضرور کرتے ہیں۔اس پس منظر میں اگر فکشن کی بات کریں تو پریم چند یا دیگر ادیبوں کی تحریروں کو اپنی تنقید کا موضوع بناتے وقت آپ ان کے فن و شخصیت کو ان کے ماحول کے لحاظ سے پرکھتے ہیں۔اسی طرح آپ شاعری کا تجزیہ کرتے وقت بھی شاعر کی حالات زندگی اور اس کے وقت کی سرگرمیوں کو بھی موضوع بحث بناتے ہیں۔غرض کہ قمر رئیس کسی بھی فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت اس فن پارے کے وجود میں آنے کے اسباب و عوامل پر بھی غور و فکر کرتے ہیں۔وہ خود اپنی اس خاصیت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جن حضرات کی نظر سے میری بعض دوسری تحریریں گزری ہیں ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہوگی کہ میں تنقید میں ایک خاص دبستان سے تعلق رکھتا ہوں جسے عام طور پر ادب کی 'سماجیاتی تنقید' کا نام دیا گیا ہے اور جس کے مطابق شعر و ادب کو سماجی محرکات اور ماخذوں کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا، سمجھا اور پرکھا جاتا ہے۔''

(تلاش توازن۔ڈاکٹر قمر رئیس،ص۔۰۷)

جہاں تک مارکسزم کی بات ہے ان کی شخصیت اور اسلوب پر اس کے کافی اثرات مرتب ہوئے۔ان کے زیادہ تر نظریات اسی دبستان سے وابستہ نظر آتے ہیں جس کے زیر اثر وہ مختلف تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں۔ان کی تحریروں میں جا بجا اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔مارکسزم کے بارے میں وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ میں اپنے ادبی موقف اور تنقیدی تفہیم میں مارکسزم سے روشنی حاصل کرتا رہا ہوں۔ مارکسزم میرے نزدیک کوئی عقیدہ یا بے لچک میکانکی نظریہ نہیں بلکہ زندگی، تاریخ، معاشرہ اور انسانی کلچر کے مظاہر کی تفہیم و تعبیر کا ایک کشادہ سائنسی طریق کار (METHOD) ہے۔جس سے کم و بیش گذشتہ سو سال کے عرصہ میں ادب کے محرکات، ماخذوں اور ادبی سرمایہ کی تفہیم و تجزیہ میں موثر اور کارگر طور پر کام لیا گیا ہے۔''

(تعبیر و تحلیل۔پروفیسر قمر رئیس،ص۔۱۰)

فکشن کے نقاد کی حیثیت سے بھی ان کو اہم مقام حاصل ہے۔انہوں نے فکشن میں اس وقت قدم رکھا جب اس حوالے سے بہت کم تحریریں وجود میں آئی تھیں۔قمر رئیس نے اپنے نظریات وخیالات سے اس میدان کو وسعت دی اور ادب میں ایک نئی راہ متعین کی جو دوسروں کے لیے بھی کارگر ثابت ہوئی۔ان کی اس کوشش کے متعلق پروفیسر عتیق اللہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''میں نے کسی جگہ لکھا تھا کہ قمر رئیس کی تنقید ہمارے عہد کی وسیع تر بصیرتوں کا ایک معتبر حوالہ ہے اردو میں فکشن کی تنقید کے اولین بنیاد گذاروں میں قمر رئیس کا نام ایک علیحدہ تخصیص رکھتا ہے جس نے ایک سطح پر یہ سکھایا ہے کہ فکشن کی تنقید اپنے عمل میں کس نوعیت کی ہوسکتی ہے اور ہونی چاہیے، دوسری سطح پر یہ کہ افسانوی ادب کی تعبیر وتحلیل ایک مشکل ترعمل ہے، اس کے لیے محض ہمارے روایتی نظام بدیعیات کے معائر نا کافی ہیں۔''

(قمر رئیس ایک زندگی۔مرتب:سلمیٰ شاہین،ص۔ ۲۷۲)

ایک نقاد کو شہرت اور عزت کا اہل تبھی قرار دیا جاتا ہے جب اس کی تحریروں میں فن کے علاوہ سماج ومعاشرے کو بھی اہمیت دی گئی ہو۔اس پہلو پر اگر ہم غور وفکر کریں تو قمر رئیس اس معنی میں اہم نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔انہوں نے بنا کسی جانب داری کے تقریباً سبھی فنکاروں وادیبوں کو اپنے قلم کا موضوع بنایا۔جہاں انہوں نے پرانے لوگوں میں غالب واقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہیں نئے فن کاروں میں جوش،فیض احمد فیض،اختر الایمان اور عبدالصمد کو بھی اپنی تحریر میں شامل کیا ہے۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے سرحد پار کے فنکاروں و ادیبوں کو اہمیت دینے کے ساتھ ان کے فن کو اپنے تنقیدی نقطۂ نظر سے جانچا و پرکھا بھی ہے۔اس ضمن میں پاکستان میں مقیم احمد فراز،احمد ندیم قاسمی،لندن میں مقیم مصطفےٰ کریم اور ازبکستان کے اہم شاعروں کے بھی نام لیے جاسکتے ہیں۔احمد فراز کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ اپنی ذات کو پراسرار باطنی کوائف اور مجرد فکر میں نہیں بلکہ اپنے اردگرد کے مانوس ماحول اور اجتماعی مادی حالات میں ہی تلاش کرتا ہے۔خارجی زندگی کا ہر مظہر اور ہر منظر اس کا دامن دل کھینچتا ہے اور وہ ہر لحظہ اپنی ذات اور کائنات کے مابین نئے رشتوں کا ادراک حاصل کر کے اپنے ذہن اور تخئیل کو وسعت، نیرنگی اور شادابی بخشتا ہے۔کائنات کے دلفریب مظاہر اور ان مادی حقائق سے دلچسپی جن کا ازلی محور انسان کا وجود ہے، ندیم کی شخصیت اور تخلیقی محویت کا جوہر اور یہ جوہر اس کے ہر دور کے افسانوں میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتا اور نکھرتا رہا ہے۔''

(اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب۔پروفیسر قمر رئیس ،ص۔۱۱۷)

اہم بات یہ بھی ہے کہ آپ ان لوگوں پر بحث کرتے وقت صرف تعریفوں کے پل نہیں باندھتے بلکہ ان کی خامیوں کی جانب بھی ہماری توجہ مرکوز کراتے ہیں۔اس سلسلے میں اگر پریم چند کے ناولوں کی بات کریں تو وہ یہاں بھی ان کی کمیوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔اسی طرح جہاں عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کی تعریف کرتے ہیں وہیں ان کی دکھتی رگ پر بھی چوٹ کرتے ہیں۔مثلاً عصمت متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باعث اس طبقے کی گھریلو فضا کو بہت ہی خوبی سے پیش کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں جس میں کہ وہ خود پلی بڑھی ہیں۔لیکن جب وہ اس سے ہٹ کر اونچے گھرانوں کو بحث کا موضوع بناتی ہیں تو اس میں فن کے معیار پر کھری نہیں اترتیں۔عصمت کے متعلق قمر رئیس کے یہ قول ملاحظہ فرمائیں:

''عصمت دراصل متوسط طبقے کے اسی ماحول اور گھریلو معاشرت کی عکاسی میں کامیاب ہوتی ہیں جسے انہوں نے بچپن سے جوانی تک اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔اس سے باہر امرا اور اعلیٰ طبقے کی زندگی کو موضوع بنا کر ان کا قلم بے جان ہوجاتا ہے۔''معصومہ'' میں ان کا سماجی اور طبقاتی شعور زیادہ بیدار اور برہم سہی لیکن ''ٹیڑھی لکیر'' کے مقابلے میں ایک ادنیٰ درجے

کی تخلیق ہی قرار پائے گی۔''

(اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب ۔ پروفیسر قمر رئیس، ص۔۲۵۳)

ان کی اس غیر جانب دارانہ خاصیت کی تعریف اردو کے اہم نقاد پروفیسر نورالحسن نقوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''اردو تنقید کا موجودہ دور اس اعتبار سے نہایت اطمینان بخش ہے کہ اب ہماری تنقید نے عصبیت، ادعائیت اور جانب داری سے بڑی حد تک نجات پالی ہے۔اس نے کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا، فن پارے کو بیک وقت مختلف زاویوں سے دیکھنا اور معروضی انداز میں پرکھنا سیکھ لیا ہے۔ یہ خوش گوار تبدیلیاں جن نقادوں کی کوشش وکاوش کی رہن منت ہیں ان میں ایک نمایاں نام پروفیسر قمر رئیس کا ہے۔''

(قمر رئیس: ایک زندگی۔مرتب: ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ص۔۲۸۴)

قمر رئیس اپنی زندگی کے آخری دنوں میں نئی حقیقت پسندی کا نام لیتے تھے یعنی ان کے ذہن میں نئی ترقی پسندی تھی جس کے زیر اثر انہوں نے بعض لوگوں پر مضامین بھی لکھے مثلاً عمیق حنفی اور شاذ تمکنت پر لکھے گئے مضامین کے علاوہ افسانہ نگاروں پر جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ان کی نئی سوچ اور نظریات کا ضامن نظر آتا ہے۔ یہاں وہ کسی جامد تصور کے حامل نظر نہیں آتے بلکہ ان کے یہاں فن اور ٹکنیک کے اعتبار سے بھی کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔اس اعتبار سے وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ادب میں موجود اچھی چیزوں کو شامل کرنے پر زور دیتے تھے۔اس لیے نئی ترقی پسندی کے حوالے سے بھی انہیں یاد کیا جاتا ہے۔شاذ تمکنت پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

''اس دور میں جن نوجوان شعراء نے اپنے سنجیدہ تخلیقی انہماک اور منفرد آواز سے اپنی طرف متوجہ کیا، ان میں شاذ تمکنت کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے ....شاعری ان کے یہاں داخلی تصویر کشی ہے۔ان کی، خلوت آرائی، اور خود کلامی دراصل باطنی حقیقتوں کے ادراک یا عرفان ذات کا ذریعہ ہے۔اس لیے بعض ترقی پسند شعرا کی طرح گرد وپیش کے ٹھوس اور سنگین حقائق ان کی شاعری کا محرک اور موضوع نہیں بنے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری اجتماعی احساس سے عاری ہے۔''

(تلاش وتوازن۔ڈاکٹر قمر رئیس، ص۔۲۴۸۔۲۴۹)

ان نظریات کی روشنی میں قمر رئیس اردو تنقید میں کسی ایک رجحان کے مبلغ نظر نہیں آتے بلکہ وہ ہر اس نظریہ کا استقبال کرتے جن سے ادب کو فائدہ پہونچے اور عوام تک اس کی رسائی ہو سکے۔وہ کسی بھی دبستان اور اس کی خوبیوں کو یکسر نظر انداز نہیں کرتے اور نہ ہی ادب میں کسی لیبل کے تحت کام کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔انہوں نے ہر اس تخلیق پر کھلے دل سے اظہار کیا جو کسی نئے رجحان کے زیر اثر وجود میں آئی۔آپ نے تنقید کے میدان میں پریم چند سے لے کر فکشن، شاعری اور ترقی پسند تنقید ان سب کے حوالے سے کافی گراں قدر خدمات انجام دیں۔اردو تنقید کے حوالے سے ان کی یہ کاوشیں ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی اسی محنت ولگن کا نتیجہ ہے کہ اردو تنقید میں انہیں اہم مرتبہ حاصل ہے۔

بقیہ، ص:۳۶ /کا

مشبہ (ٹھکانہ اور پناہ گاہ) محذوف ہے اور مشبہ بہ (نشیمن) مذکور ہے، مشبہ اور مشبہ بہ میں سے کوئی ایک محذوف ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں، اگر مشبہ محذوف ہو تو اسے استعارہ تصریحیہ اور مشبہ بہ محذوف ہو تو اسے استعارہ مکنیہ کہتے ہیں، اس شعر میں استعارہ تصریحیہ جاری ہوا ہے۔استعارہ کے ساتھ اگر مشبہ کے مناسب کوئی لفظ لایا جائے تو اسے استعارہ مجردہ کہتے ہیں، اس شعر میں استعارہ مجردہ پایا جارہا ہے؛ کیوں کہ مشبہ کے مناسب درگہ (درگاہ) کا لفظ موجود ہے۔

اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ انسان کو صرف خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے، خدا ہی سے امید وابستہ رکھنی چاہیے اور بہ ہر صورت خدا ہی کی پناہ میں آنا چاہیے۔

'لا ملجا ولا منجا منک الا الیک'۔

احمد نور عینی
پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اقبال فہمی

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

حل مفردات:

نشیمن: آشیانہ، گھونسلہ۔ **درگہ** (درگاہ کا مخفف): دربار، آستانہ، مزار۔ **میر** (امیر کا مخفف): سردار، سالار، حاکم۔

تشریح: اس شعر میں علامہ اقبال خدا سے مخاطب ہیں، شعر کے پہلے مصرع میں اقبال کہہ رہے ہیں کہ میر ووزیر کا دربار میرا ٹھکانہ نہیں ہے، دوسرے مصرع میں کہہ رہے ہیں کہ اے خدا! میرا ٹھکانہ اور میری امیدوں کا مرکز، میری پناہ گاہ اور حفاظت گاہ صرف آپ کی ذات والا صفات ہے۔

پرندوں کی دنیا میں نشیمن کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، باد صرصر کی بلا خیزیاں ہوں، یا ابر باراں کی فیاضیاں، سرد ہواوں کے تھپیڑے ہوں یا باد سموم کی لہریں، موسم جب بھی ناخوش گوار ہوتا ہے پرندے اپنے نشیمن ہی کی پناہ لیتے ہیں، آفتابِ جہاں تاب جب ضیا پاشیاں کر کے وقتِ رخصت شامِ سیہ قبا کو طشت افق سے لاکر لالے کے پھول مارتا ہے اور لیلائے شب اپنی زلفِ دیجور آکاش کے کاندھوں پر پھیلاتی ہے تو تاریکی کی گھنگھور گھٹاوں کا خوف پرندوں کو سوئے نشیمن مائل بہ پرواز کرتا ہے۔ بیضہ اندازی سے لے کر بچوں کے خوگرِ پرواز ہونے تک نشیمن ہی پرندوں کا سہارا و آسرا ہوتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح پرندوں کا ٹھکانہ اور ان کی پناہ گاہ، ان کا سہارا اور ان کی حفاظت گاہ ان کا نشیمن ہی ہوا کرتا ہے، اسی طرح میرا ٹھکانہ اور میری پناہ گاہ، میرا سہارا اور میری حفاظت گاہ، میری امیدوں کا مرکز اور میرے قلب پریشاں کا قبلہ، میرا ماوی وملجا صرف آپ ہی کی ذات بے ہمتا ہے۔ حالات کی ستم ارزانیاں ہوں، آسمان عداوت کی برق رسانیاں ہوں، آشناوں کی فریب کاریاں ہوں، شناساوں کی دل آزاریاں ہوں، شر پسندوں کی فتنہ سامانیاں ہوں، بدخواہوں کی ریشہ دوانیاں ہوں، نفس کے پھسلاوے ہوں، شیطان کے بہکاوے ہوں، شادمانیوں کے نغمے ہوں، ناکامیوں کے صدمے ہوں، دل غم سے چور ہو یا خوشیوں سے بھرپور ہو، خوف ودہشت کی فضا ہو، ظلم واستبداد اور جفا ہو، غرضے کہ حالات جیسے بھی اور جو کچھ بھی ہوں اے خدا میری پناہ گاہ تو صرف آپ ہی ہیں، میں سارے جہاں سے بھاگ کر اور سب کچھ تیاگ کر صرف آپ ہی کی پناہ میں آتا ہوں۔ ایک آپ ہی کی ذات ہے جس کی پناہ میں آکر، جس کی یاد دل میں بسا کر جس کی چوکھٹ پہ سر جھکا کر، جس کے دربار میں ہاتھ پھیلا کر، جس سے پریم کی لو لگا کر دل کو قرار ملتا ہے، اطمینان نصیب ہوتا ہے، سکون کی دولت ہاتھ آتی ہے، ذہنی الجھن دور ہوتی ہے، دل کی بے چینی کافور ہوتی ہے، من کی دنیا خوشیوں سے معمور ہوتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مجھے میر ووزیر کے در ودربار سے کیا سروکار، وہ تو خود محتاج ہیں، دنیا کی ظاہری شوکت وحشمت اور کچھ اضافی مال ودولت انہیں ضرور حاصل ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان کی فانی شوکت ودولت کے سائے میں اپنی پناہ تلاش کروں اور لافانی قوی وغنی خدائے بے نیاز سے رشتہ توڑ لوں۔ شاخِ نشیمن سے اقبال نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ خدا کی پناہ حاصل کرنے اور اس سے امیدیں وابستہ کرنے کے لیے کسی مخلوق کے سہارے اور واسطے کے محتاج نہیں ہیں۔

اس شعر میں اقبال نے ٹھکانہ اور پناہ گاہ کو نشیمن سے تشبیہ دی ہے،

بقیہ، ص: ۳۵ پر

رفیعہ تبسم
پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

مسجد نبوی کی توسیع اور مختلف ادوار میں اس کی تاریخ

مسجد نبوی ان مساجد میں سے ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی گواہی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دی ہے:

لمسجد اسس علیٰ التقویٰ من اول یوم احق ان تقوم فیه، فیه رجال یحبون ان یتطهروا واللہ یحب المطهرین (سورۃ التوبہ، آیت ۱۵۸)

ترجمہ: پہلے روز ہی سے جس مسجد کی بنیاد تقوی رکھی گئی ہے اس کا زیادہ حق ہے کہ آپ اس میں قیام کریں اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اس میں آیت سے مراد مسجد نبوی ہے (صحیح مسلم کتاب الحج حدیث نمبر: ۱۵۔۱۳۹۸)

مسجد نبوی صرف ادائے نماز کے لیے نہ تھی بلکہ یہ ایک یونیورسٹی تھی جس میں مسلمان اسلامی تعلیمات وہدایات کا درس حاصل کرتے تھے۔ یہ ایک محفل تھی جس میں مدتوں جاہلی کشاکش ونفرت باہمی لڑائیوں سے دوچار ہونے والے قبائل کے افراد اب میل ومحبت سے رہ رہے تھے۔ یہ ایک مرکز تھا، جہاں سے اس ننھی سی ریاست کا سارا نظام چلایا جاتا تھا علاوہ ازیں اس کی حیثیت ایک پارلیمنٹ کی بھی تھی، جس میں مجلس شوریٰ اور مجلس انتظامیہ کے اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ (الرحیق المختوم، ص: ۲۸۹)

ہجرت

جب کفار مکہ نے آپؐ اور اصحابؓ کو اپنی ظالمانہ رویوں سے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے آپؐ نے بعض اصحابؓ کو حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت دی۔ حبشہ کی جانب ہجرت دو مرتبہ ہوئی پھر مدینہ (یثرب) کے بعض اسلام قبول کر کے چلے گئے تب نبی کریمؐ نے اپنے اصحاب کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا اور جس وقت کفار نے آپؐ کو قتل کرنے کی سازش مکمل کر لی تو اللہ نے آپؐ کو اس سے باخبر کیا اور آپؐ کو بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت مل گئی۔

مدینہ

آپؐ یثرب تشریف لانے کے بعد یثرب کا نام مدینۃ النبی نبی کا شہر مشہور ہوا۔ مدینے کے لوگوں کو آپؐ کی آمد کی خبر ہو چکی تھی، سب لوگ منتظر تھے، بچے خوشی اور جوش میں گلی کوچوں میں کہتے پھرتے کہ ہمارے پیغمبر آرہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں چھتوں پر چڑھ کر آپؐ کے آنے کی خوشی میں گیت گاتی تھیں تو نوجوان ہتھیار سے سج دھج کر شہر کے باہر نکل جاتے تھے۔ یہ ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ اور نبوت کا تیرھواں سال تھا۔ آپؐ قبا میں چودہ دن رہے، وہاں مسلمانوں کے معزز لوگ تھے۔ وہاں پر آپؐ نے ایک چھوٹی مسجد کی بنیاد رکھی اس مسجد کا نام 'مسجد قبا' ہے، یہاں سے آپؐ نے مدینہ کا رخ کیا، راستے میں نماز کا وقت آ گیا آپؐ کی امامت میں لوگوں نے وہاں جمعہ پڑھا۔ آپؐ نے ایک تقریر کی، جس نے سنا، وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔

مسجد نبوی اور حجروں کی تعمیر

مدینے میں مسلمانوں کو سب سے پہلے خدا کا گھر یعنی مسجد بنانا تھا۔ آپؐ جہاں ٹھہرے تھے اس سے ملی ہوئی

نجار قبیلہ کے دو یتیم بچوں کی ایک زمین تھی۔ آپؐ نے اس زمین کو مسجد کے لیے پسند کیا۔ دونوں یتیم بھائی سہل و سہیل ہدیتاً پیش کی، لیکن آپؐ نے انکار کیا اور قیمت دس دینار ادا کر کے زمین حاصل کی زمین برابر کر کے مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس مسجد کے بنانے والے معمار اور مزدور کون تھے۔ خود آپؐ اور آپؐ کے وفادار ساتھی سب نے مل کر ایک کچی سی دیوار اٹھا کر اوپر کھجور کے تنے اور پتوں کی چھت بنالی۔ یہی پہلی مسجد نبوی تھی۔

خلفائے راشدین کے دور میں مسجد نبویؐ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں صرف ستون بوسیدہ ہوئے تھے، انہیں تبدیل کیا گیا جو کھجور کے تنوں کے تھے (دلائل النبوۃ بیہقی، ص:۵۴۱)

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں مسجد نبوی کی توسیع ۱۷ھ۔ ۶۳۸ء فاروق اعظمؓ کے دور میں آبادی زیادہ ہوگئی تو لوگوں نے مسجد کی توسیع کی درخواست کی، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہؐ سے یہ نہ سنا ہوتا کہ ہماری مسجد بڑھے گی تو میں کبھی توسیع نہ کرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے زمانے میں مسجد اینٹوں اور شاخوں سے بنی ہوئی تھی۔ ستون کھجور کے تھے۔ حضرت عمرؓ نے توسیع اس کی کہ سابقہ تعمیر کی طرح اینٹوں اور کھجوروں کی شاخوں سے تعمیر کی اور اس کے ستون لکڑی کے تھے (سنن داؤد۔ کتاب الصلاۃ باب فی بناء المساجد۔ حدیث نمبر ۴۴۹)

حضرت عمر فاروقؓ نے قبلہ کی طرف پانچ میٹر توسیع کردی اور شمال کی طرف پندرہ میٹر اور مغرب کی جانب دو ستون زیادہ کیے اور چوڑائی ساٹھ میٹر ہوگئی، چھت گیارہ ہاتھ بلند کردی گئی اور مغربی دیوار کے شروع میں جنوب کی جانب ایک دروازہ باب اسلام بڑھا دیا گیا اور مشرقی دیوار میں عورتوں کے لیے علیحدہ دروازہ بنایا گیا اور وادیٔ عقیق سے کنکریاں لاکر مسجد میں بچھادی گئی اور مسجد نبوی کے مشرقی جانب مسجد کے باہر کے حصے میں ایک کمرہ جیسی جگہ متعین کی تاکہ گفتگو کرنا ہو تو جاکر کریں۔ کسی قسم کا مشورہ وغیرہ ممنوع اور خلاف ادب ہے اور لوگ خشوع کے ساتھ عبادت کرسکیں۔ (الوفاء الوفا ج۲ ص:۴۹۸)

دور عثمانی میں توسیع

۲۹ھ۔ ۶۴۹ء میں شہید مظلوم خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ نے قبلہ کی طرف شمال اور مغرب کی طرف مسجد نبوی کی توسیع، قبلہ کی طرف ستونوں کی ایک رو بڑھا کر قبلہ تعمیر کی۔ واضح رہے کہ آج تک قبلے کی دیوار وہیں ہے اور اس طرف کوئی توسیع نہیں کی گئی۔ مغرب کی طرف بھی ستونوں کی ایک رو کا اضافہ کیا اور وہ منبر سے آٹھوی ستون تک ہے، اسی طرح ہر اطراف تقریباً پانچ پانچ میٹر کی توسیع کی۔ حضرت عثمانؓ خود تعمیر کی نگرانی کرتے۔ عبدالرحمٰن بن سفینہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود دیکھا کہ تعمیری اشیاء لائی جاتی تو خود مشاہدہ کرتے اور تعمیر کرنے والے مشغول ہوتے تو کھڑے ہوکر نگرانی کرتے، نماز کا وقت ہوتا تو نماز پڑھاتے۔ گھر جاکر آرام کرتے بعض دفعہ مسجد میں ہی سوجاتے۔ (تحقیق النصرۃ، ص:۴۷۔ عمدۃ الاخبار، ص:۱۵۸)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خلفائے راشدین حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے تعمیرات میں مشرق کی جانب کوئی توسیع نہیں کی، اس لیے ادھر نبی کریمؐ کی ازواج مطہرات کی رہائش تھی، لیکن عبدالملک مروان کے دور حکومت سے پہلے تمام ام المومنین کا انتقال ہو چکا تھا، حجرے تاحال موجود تھے اور ان کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے اور جمعہ کے روز حاضرین کی تعداد بڑھ جاتی تھی۔ لہٰذا کچھ لوگ ان حجرات میں داخل ہوکر نماز ادا کرلیتے تھے، اس لیے ولید عبدالملک نے ۸۸ھ۔ ۷۰۷ء میں مسجد نبوی کی ازسرنو تعمیر کروایا تو ازواج مطہرات کے حجروں کی مسجد میں شامل کرلیا گیا۔ (وفاء الوفا ج۲، ص:۵۱۷)

بقیہ آئندہ

حکیم سید شاہ محمد خیر الدین قادری، صوفی (نبیرہ شاہ چراغ دکن)، حیدرآباد

حضرت محمد رفیع الدین قندھاریؒ

خالق کائنات ہر دور میں اپنے محبوب اور منتخب بندوں کی عالم انسانیت کی ہدایت و رہبری کے لیے پیدا فرماتا ہے۔ ایسے انسان اپنے حقیقی مقصد کو جب فراموش کر کے دنیا کے عیش و عشرت میں کھو کر اپنے مالک سے دور ہوتا ہے تو ایسی شخصیات نمودار ہوتی ہے اور بھٹکتی ہوئی انسانیت راہِ راست پر گامزن کرتی ہیں، وہی لوگ ان سے فیض حاصل کرتے ہیں جن کا دل ابھی تاریک میں پوری طرح غرق نہیں ہوا اور وہ لوگ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو جاتے ہیں وہ ان اللہ کے محبوب بندوں سے بغض و حسد رکھتے ہیں اور ان کی رہبری کو اپنی توہین سمجھ کر ان پر الزامات لگا کر ان کو رسوا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، بالآخر وہی ذلیل و خوار ہو کر فانی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اللہ کے محبوب بندوں کو دنیا داری سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے وہ صرف اپنی ذمہ داری کو پوری کرنے میں لگے ہوتے ہیں، اس کے لیے خواہ ان کو کتنے ہی نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا اپنی ذمہ داریوں سے نہیں ہٹتے۔ انہیں اللہ کے برگزیدہ بندوں میں حضرت شاہ محمد رفیع الدین فاروقی قندھاریؒ کی عظیم المرتبت شخصیت ہے، آپ کا سلسلہ نسب چھتیسویں پشت سے حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ آپ کا اسم گرامی غلام رفاعی عرف محمد رفیع الدین ابن محمد شمس الدین ابن محمد تاج الدین ہے۔ ایک عرصہ تک آپ کے والد محترم کو اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت سید حاجی سیاح سرور مخدوم قندھاریؒ آپ کے والد محترم کے خواب میں لڑکے کی بشارت ہوئی اور اس لڑکے کا نام اپنے نام پر رکھنے کی وصیت کی۔ بتاریخ ۱۹؍جمادی الثانی ۱۱۶۴ھ بروز جمعرات بعد نماز فجر آپ کی ولادت ہوئی۔ حضرت خواجہ رحمت اللہ آپ کے پیرومرشد ہیں، علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل تھا۔ دو مرتبہ آپ بلاد حیدرآباد افروز ہوئے ہیں، پہلی دفعہ مکہ مسجد میں قیام فرمایا، آپ کی کافی شہرت ہوئی لاکھوں لوگ آپ سے بیعت ہوئے۔ جب یہ خبر مواد المہام اعظم الامراء ارسطو جاہ کو پہنچی تو اس بادشاہ وقت نواب سکندر جاہ سے آپ کو قندھار تشریف لے جانے کا مشورہ دیا، جس کی بناء پر آپ قندھار تشریف لے گئے دوسری مرتبہ امیر کبیر فخر الدین شمس الامراء بہادر کی درخواست پر حیدرآباد تشریف لائے اور شمس آباد میں قیام فرمایا، جہاں عوام کے علاوہ تمام خاندان پائیگاہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت سے مشرف ہوئے۔

نواب شمس الامراء بہادر پر ان کی خاص نظر تھی نواب موصوف صوم و صلوۃ کے پابند اور تہجد گزار تھے وظائف کا ورد کرتے تھے۔ آپ نے شمس الامراء بہادر کو خلافت سے سرفراز کر کے ایک تسبیح عطا کی نواب موصوف اس تسبیح کو کبھی خود سے جدا نہیں کیا، پھر آپ قندھار تشریف لے گئے ۷۷؍سال عمر شریف میں ۱۶؍رجب ۱۲۴۱ھ حضرت سرور مخدوم کے صدم مبارک کے روز اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ شاہ رفیع الدین فاروقی کا فیضان آج بھی شہر حیدرآباد سے اقطاع عالم میں جاری و ساری ہے، بانی جامعہ نظامیہ امام الآئمہ حضرت مولانا شاہ انوار اللہ فاروقیؒ حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے نواسے ہیں اور شہر حیدرآباد میں شمع اسلام کو روشن کرنے والے حضرت مولانا حافظ قاری میر شجاع الدین حسین قادری، جن کا گنبد مبارک عبدی بازار میں ہے، حضرت شاہ رفیع الدین قندھاریؒ خلیفہ خاص میں جن کے اسم گرامی سے جامع سماعیہ چار مینار موجود ہے۔

اللہ والے جب بے لوث اللہ کے بندوں کی خدمت کرتے ہیں تو ان کے پردہ کرنے کے بعد بھی ان کا فیضان جاری و ساری رہتا ہے۔ آج جامعہ نظامیہ و بانی جامعہ کا فیضان پھیلا رہے ہیں، کتنے ہی اولیاء کرام کو یہاں سے روحانی فیض بھی حاصل ہوا۔

ہر بندے مومن کو اپنے فرائض منصبی سے غافل نہیں ہونا چاہئے اور اللہ کے محبوب بندوں سے فیض حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کرنا چاہئے۔ آج بعض گوشوں سے یہ آوازیں آتی ہیں ایسے لوگ اب کہاں ہیں، ہر دور میں اللہ کے محبوب بندے ہوتے ہیں، اب یہ طالب پر منحصر ہے کہ ان تک پہنچے۔

ابو ہریرہ ایوبی 18 نیوز

پاکستان کو ملا نیا کپتان

پاکستان میں انتخابات کا شاندار انعقاد اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ پاک عوام کو جمہوریت میں پورا بھروسہ ہے۔حالانکہ پی ایم ایل (ن) اور پی پی پی انتخابی عمل پر سوال کھڑے کر رہی ہیں۔بڑے پیمانے پر دھاندلی کی بات بھی کہی جارہی ہے مگر اس طرح کے الزامات پہلے بھی لگتے رہے ہیں۔ پاکستان کے لیے عام چناؤ انتہائی اہم ہیں۔ملک ان دنوں نازک دور سے گذر رہا ہے۔ سیاسی عدم استحکام، دہشت گرد تنظیموں کی مضبوط ہوتی جڑیں، مذہبی و مسلکی منافرت و تشدد، سماجی انحطاط، اقتصادی کمزوری، بیروزگاری، کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کی زبوں حالی سمیت مختلف شعبوں میں پاکستان کی حالت خستہ ہے۔پاکستان کی موجودہ حالت کے لیے ذمہ دار وہاں رہی اب تک کی حکومتیں ہی ہیں، جنھوں نے عوام کو ٹھگا ہے۔چناوی سیاست سے نواز شریف کی چھٹی ہونے اور پی پی پی کی مقبولیت میں بتدریج کمی کا فائدہ تحریک انصاف پارٹی کو ملا ہے۔ پاکستانی عوام نے عمران خان کی پارٹی، تحریک انصاف پر بھروسہ جتایا ہے۔عوام بدلاؤ چاہتی تھی، اس لیے انھوں نے دنیائے کرکٹ میں پاکستان کو عالمی چیمپین بنانے والے کپتان عمران خان کے ہاتھوں میں ملک کی سیاسی کمان سونپ دی ہے۔

کرکٹر سے سیاست داں بنے عمران خان کی مسلسل جدوجہد بلا آخر رنگ لائی اور بیس سال کے طویل انتظار کے بعد انھوں نے پاکستان کی باگ ڈور سنبھال لی۔عمران خان کے لئے یہ جیت اس لئے بھی بہت اہم ہے کیوں کہ عمران کو سیاست میں تجربہ نہیں تھا۔اور مقابلہ ملک کی سیاست کی اہم ستون سمجھی جانیوالی مسلم لیگ نون پاکستان پیپلز پارٹی سے تھا۔ تجزیہ کاروں کا ماننا ہے کہ پچھلے بیس برسوں میں سرگرم سیاست میں رہنے کے بعد، عمران خان کافی داؤ پیچ سیکھ چکے ہیں۔ان بیس برسوں میں عمران خان کے سامنے بھی کئی مشکلات آئیں، لیکن وہ ڈٹے رہے۔۔ظاہر سی بات ہے کہ کھیل کے میدان سے سیاست تک کا سفر آسان نہیں تھا۔ ان سب کے بیچ عمران کی ازدواجی زندگی بھی اتار چڑھاؤ کا شکار رہی۔۔۔لیکن، عمران نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔۔تحریک انصاف پاکستان کی کامیابی اور عمران خان کے وزیر اعظم بننے سے صرف پاکستان میں ہی خوشی یا جشن کا ماحول نہیں ہے۔ بلکہ عمران کی جیت پر ہندوستان میں بھی لوگوں نے مسرت کا اظہار کیا۔عمران پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستانی حکومت اور عوام کے لئے امید کی ایک کرن بن کر آئے ہیں۔کرکٹ سے لیکر بالی ووڈ سب نے عمران کی جیت پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔خود وزیر اعظم نریندر مودی نے عمران کی شاندار جیت پر مبارک باد پیش کی۔۔تو وہیں عمران خان نے بھی جیت کے بعد میڈیا سے بات کرتے ہوئے ہندو پاک تعلقات کو بہتر کرنے کی بات کہی۔انھوں نے امید جتائی کہ آنے والے دنوں میں دونوں ممالک کے درمیان رشتے ہموار ہوں گے۔اور سرحد کے آر پار لوگ پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کی عام انتخابات میں کامیابی پر کرکٹ دنیا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

پاکستان سمیت دنیا کی تمام کرکٹ کھلاڑیوں نے عمران کو مبارک باد پیش کی ہے۔(بقیہ، ص:۲۴/ پر

احکام فطرت کی شرعی وسائنسی حیثیت

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔(ادارہ)

مرتب: مفتی شکیل احمد رحمانی

صفحات: ۵۱۲

قیمت: ۲۰۰/روپے

ملنے کا پتہ: نامپلی وچارمینار کے تمام بک اسٹال پر دستیاب ہے

تبصرہ نگار: مولانا سید ومیض ندوی

حضرات علماء کرام نے امور فطرت سے تعلق رکھنے والی احادیث شریفہ کی تشریح کا خصوصی اہتمام فرمایا ہے، ویسے ان امور پر شروح احادیث میں شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن یہ مواد صرف علماء کرام ہی کے زیر مطالعہ آتا ہے، ضرورت تھی کہ امور فطرت رکھنے والے والی ان احادیث کو باقاعدہ ایک مفصل کتاب کا موضوع بنا کر ان سے متعلق مواد اور دیگر فقہی تفصیلات کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا مفتی شکیل احمد رحمانی کو انہوں نے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی زیر سرپرستی اس اہم علمی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور احکام فطرت کی شرعی وسائنسی حیثیت کے نام سے ایک انتہائی مبسوط اور وقیع کتاب تالیف فرمائی، احادیث شریفہ میں ذکر کردہ امور فطرت پر مواد کے لحاظ سے یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، ۵۱۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں احکام فطرت کی شرعی وسائنسی حیثیت کو نہایت محققانہ اسلوب میں اجاگر کیا گیا ہے، فاضل مؤلف نے موضوع سے متعلق تمام مراجع اصلیہ سے استفادہ کرتے ہئے اس قدر مفصل بحث فرمائی ہے کہ قاری کو کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا، اسلوب تحریر شستہ وشائستہ ہے، ہر بات حوالہ جات اور فقہی مراجع سے مزین ہے، کتاب کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ نبیؐ نے جن امور فطرت کا حکم فرمایا ان کی سائنسی افادیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے، اس حوالے سے اگر چہ حجۃ اللہ البالغہ اور حضرت تھانوی کی شہرہ آفاق تصنیف ''احکام اسلام عقل کی نظر میں'' خاصا مواد پایا جاتا ہے، لیکن معاصر شخصیات میں ڈاکٹر طارق محمود چغتائی کی کاوشیں قابل قدر ہیں، مؤلف نے ان کی تحریروں سے بھرپور استفادہ کیا ہے، اس طرح زیر نظر کتاب عصری تعلیم کے اس طبقے کے لیے بے حد مفید اور لائق استفادہ ہے جو دین کے احکام کے سائنسی مصالح جاننے کا شوقین ہے، کتاب کے استناد کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس کے آغاز پر فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کا وقیع مقدمہ۔

مؤلف کتاب حضرت مولانا مفتی شکیل احمد رحمانی تحقیقی ذوق رکھنے والے ایک جواں سال عالم دین ہیں، جو تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت اور تعلیم وتدریس کے مختلف

میدانوں میں نہایت گراں قدر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، تحریر وتالیف کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، اس سے قبل ان کی کئی کتابیں شائع ہوکر مقبول عام حاصل کرچکی ہیں۔ زیرنظر کتاب اسی سلسلۃ الذہب کی کڑی ہے، ہمیں امید ہے کہ اس وقیع علمی کتاب سے عوام اور اہل علم دونوں طبقات استفادہ کریں گے، اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس خدمت کو شرف قبول عطا فرمائے اور سب کے لیے نافع بنائے۔ (آمین)

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

کی طرف سے ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے قارئین اور اہل وطن کو

عیدالاضحی اور یوم آزادی 15/اگست

کی پرخلوص مبارکبادی پیش کی جاتی ہے

منجانب: مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

Mohammed Abdul Khader
Cell : 9392492002
: 9885959976
HUSSAIN
KIRANA STORE
WHOLESALE & RETAIL
Specialist in : All Kinds of Catering Suppliers
22-3-480/482, Clock Tower Main Road,

حسین کیرانہ اسٹور ہول سیل اینڈ ریٹیل
H.K. Caterers
مین روڈ میر عالم منڈی حیدرآباد

LUCKY
NUTRITION SHOP
Contact
9966762525

CAPTAIN ARSHAD
MR. INDIA & 7 TIMES A.P. CHAMPION
Cell : 9966762525

Founder of :
Lucky Gym
Complete Body Building & Fitness Centre

HOTEL ARMAAN

A COMPLETE FAMILY DINING HALL

ہوٹل ارمان

Explore the authentic flavours from
Hyderabad through
our richly prepared aromatic
DUM BIRYANI &
varieties of KABABS & DESSERTS

Shakeel Estate, Panjesha Gulzar Houz, Hyderabad.
Cell: 9392012642 / 8801777500 / 9392932060
Ph: 040-24566786

M. HILAL COLLECTION

Wholesale & Retail

Spl. in:
Lucknavi Chicken Suits,
Kurta Pyjamas,
Readymade Suits,
Nighties, Tops
& Cotton Suits Etc.

#23-1-1083, Opp. Charminar Bus Stand,
Hyderabad. T.S.
Contact: 09032675243, 09392533661

Shoe world

Estd. 1963

STYLISH & QUALITY FOOT WEAR

SHOE WORLD CIRCLE

Pathergatti, Hyderabad. Ph.: 040 24576852

SHOE WORLD

Abids, Hyderabad, Ph.: 040 24608208

NATURAL SOURCE OF PROTEIN VITAMINS & MINERALS

GEM™ FOODS

FRUITS NUTS & HONEY

(A Power House of Nutrients for entire family)

IMPROVES IMMUNE SYSTEM
IMPROVES STAMINA & VIGOR | IMPROVES MEMORY POWER
NATURAL ENERGY BOOSTER

Mfg. By:
GEM FOODS
IMPORTERS & EXPORTERS

Cell: 77991 99771
www.gemfoodsindia.com

#19-5-44/A/18, Nandi Muslaiguda, Kishan Bagh, Hyderabad - 500 064
'A' Grade Agmark Certified | An ISO 22000:2005 Certified Company | FSSAI LIC No. 13616015000047

GRAPHICS ZONE

DESIGNING SOLUTIONS

Multi-Colour Designing & Printing
Book Work | Invitation Cards
994 816 1239

#22-7-387/7, Opp. City Civil Court,
Old Commissioner Office Road,
Purani Haveli, Hyderabad - 500 002,
040 6666 9239, gzather@gmail.com

RNI: TELUED02136/2018

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

MOHD. MUHAMID HILAL, Owner, Publisher, Printer & Editor

Email: sadaeshibli@gmail.com, muhamidhilal@gmail.com - Cell: 9392533661, 8317692718

H.No. 17-6-352, 2nd Floor, Bafana Complex, Near Success School, Dabeerpura, Hyderabad - 500023, T.S.

SHIFA HONEY

غذا بھی، دوا بھی اور سُنّت بھی

صدیوں سے شہد اپنی طبّی فوائد کی وجہ سے استعمال ہو رہا ہے۔ شفا ہنی کا مستقل استعمال موٹاپے، السر، کھانسی، گلے کی تکلیف میں مفید ہے۔ اپنی اینٹی سپٹک خصوصیات کی وجہ سے جلے کٹے، زخموں کو آرام پہنچاتا ہے۔ آنکھوں کے لیے فائدہ مند اور جلد کی حفاظت کے لیے مفید ہے۔ اس میں شامل قدرتی پروٹینز، منرلس، وٹامینز بچوں اور بڑوں کے لیے توانائی فراہم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔

قدرت کا انمول تحفہ

شفا ہنی شہد

قدرتی اور خالص

شہد میں لوگوں کے لیے شفا رکھی گئی ہے۔ (القرآن)

PRODUCTS INSPIRED BY TIBBE NABWI

SUNNAH ENTERPRISES

Hyderabad - 500 053, T.S. INDIA

Ph: 9848361114

UMBRELLA BRAND TEA

K.G.N TEA SALES

Cell: 9848036940
9347382492, 8688381601

#5-6-264 New Aghapura, Hyderabad - 1, T.S.